تاریخ کربلائے معلّیٰ
ڈاکٹر عبدالجواد الکلیدار (عراق)
ترجمہ و توضیحات
مقبول ساجد
حضرت امام حسینؑ ریسرچ اینڈ پبلشنگ سنٹر سرینگر

تاریخ کربلائے معلّیٰ

و

حائرالحسینؑ

مصنفہ

ڈاکٹر عبدالجواد الکلید ار

(عراق)

ترجمہ و توضیحات

مقبول ساجد

حضرت امام حسینؑ ریسرچ اینڈ پبلشنگ سنٹر سرینگر

جملہ حقوق محفوظ

کتاب کا نام ---- تاریخ کربلائے معلیٰ وحائر الحسینؑ

مصنفہ ----- ڈاکٹر عبدالجواد الکلید ار (عراق)

ترجمہ وتوضیحات ---- مقبول ساجد

پیشہ ---- اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر کلچرل اکیڈیمی سرینگر

سکونت ---- خوشی پورہ ایچ۔ایم۔ٹی سرینگر

ای میل ---- maqboolsajid786@yahoo.com

ناشر ---- حضرت امام حسینؑ ریسرچ اینڈ پبلشنگ سنٹر سرینگر

ویب سائٹ ---- imamhussainresearch.com

فون نمبر ---- 9906564251

پہلاایڈیشن ---- اکتوبر ۲۰۱۴ء

تعداد ---- ۵۰۰

چھاپ خانہ ---- جے کے آفسیٹ پرنٹرز جامع مسجد دہلی

قیمت ---- ۱۵۰ روپیہ

❋❋❋

نوٹ:- یہ کتاب چھاپنے کے لئے مرزا ناصر علی صاحب نے اپنے اسلاف کی ایصال ثواب کیلئے حضرت امام حسینؑ ریسرچ اینڈ پبلشنگ سنٹر کو مالی امداد فراہم کی ہے۔ادارہ ان کا مشکور ہے۔قارئین سے التماس ہے کہ وہ ناصر صاحب کے اسلاف خصوصاً مرحوم والدین، نیز میرے اوراپنے اسلاف کے نام سورہ فاتحہ پڑھیں اورہمیں اپنے دعاؤں میں شامل رکھیں۔

فہرست مضامین

اپنی بات

لڑکپن سے مجھے قومی حمیت اور عقیدت ومودتِ محمدؐ وآلِ محمدؐ کی طلاطم خیز موجیں بے سکوں کئے ہوئے ہیں کہ اہلبیت اطہارؑ اور ان کے شیعوں سے وابستہ ادب اور تواریخ پر کام کروں۔ شکر اللہ کا کہ میں نے اس تعلق سے گذشتہ سترہ برسوں کے دوران کشمیری رثائی ادب اور تاریخ پر دو درجن کے قریب کتابیں تصنیف، تالیف اور مرتب کر کے شائع کیں جن میں دو جلدوں کی کشمیری مرثیے کی تاریخ وانتخاب پر مشتمل ضخیم کتاب ''کاشرِ مرثیک سفر'' اور ''تاریخ شیعان کشمیر'' کے جدید واضافہ شدہ ایڈیشن کی تدوین واشاعت بھی شامل ہے۔ اس کام کے بعد میرے دل میں یہ ارمان مچلنے لگا کہ کیوں نہ اب عتبات مقدسات کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف کی تاریخ پر کام کروں۔ اس تمنا کو ان مشاہدِ مقدسہ کی میری حالیہ زیارت نے مزید جلا بخشی۔ جونہی میں نے اس سلسلے میں کام شروع کیا تو ابتدائے تحقیق کے دوران ہی مجھے بازار میں پاکستان میں چھپی ''تاریخ نجف اشرف'' اردو زبان میں نظر نواز ہوئی جس کے بعد نجف اشرف کی تاریخ کے حوالے کوئی مزید کام کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

بایں ہمہ مزید جستجو کے دوران ڈاکٹر عبدالجواد الکلید ار کی کتاب ''تاریخ کربلائے معلیٰ و حائر الحسینؑ'' باصرہ نواز ہوئی جس کے فارسی اور اردو سمیت متعدد زبانوں میں ترجے ہو چکے ہیں۔ چالیس سال پرانی احباب جنتریوں کے مطالعے سے پتہ چلا کہ مولانا سید محمد باقر النقوی (سابق مدیر اصلاح) نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کیا ہے جو ماہنامہ ''اصلاح'' کے صدی نمبر (جنوری تا مارچ ۱۹۹۹ء) کے مطابق پہلے پہل ۱۹۷۲ء میں اس رسالے کے صفحات پر قسط وار چھپتا رہا اور بعد ازاں علاحدہ طور کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔ لیکن شومیٔ تقدیر سے یہ کتاب اتنی نایاب ہے کہ جب میں نے اس کے ایک نسخے کیلئے موجودہ مدیر

''اصلاح'' مولانا محمد جابر جوراسی سے فون پر رجوع کیا تو انہوں نے بلا ناغہ کہا کہ ادارے کے پاس رکارڈ کیلئے بھی اس کی کوئی کاپی موجود نہیں ہے۔ جسکے بعد میں نے کتاب کا ترجمہ شروع کیا اور میری ساری محنت وریاضت اور عرق ریزی کا ثمر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

کبھی ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ یہ کتاب کشمیری زبان میں ترجمہ کروں تا کہ اپنی مادری زبان کی خدمت اور وسعت ہو سکے لیکن اردو ترجمے کی نایابی بلکہ ناپیدگی سدِّ راہ آئی اور یہ سوجھا کہ بہتر ہے اردو ہی میں ترجمہ کیا جائے کیونکہ اس وقت جبکہ منصور دوانقی، ہارون رشید اور متوکل کا دور پلٹ آیا ہے، وہابیت اپنے پورے جوبن پر ہے اور عتبات عالیات پر داعش، النصرہ اور ان ہی جیسے انتہا پسند گروہوں کی دہشت گردی کے خطرات کے کالے بادل منڈلائے ہوئے ہیں، بلکہ سامرا، مشہد مقدس اور شام کی زیارتیں دھماکوں یا بمباری کی زد میں آچکی ہیں۔ حضرت یونسؑ، حضرت شیثؑ، حضرت دانیالؑ، حضرت جرجیسؑ جیسے برگذیدہ انبیائے کرام کے روضہ ہائے اطہر کو بارود کے ذریعے ملبے کا ڈھیر کرنے کے علاوہ حضرت صعصعہ بن صوحانؓ، حضرت حجر بن عدیؓ اور کئی اصحاب رسولؐ کی قبریں بیخ وبن سے اکھاڑ دی گئیں ہیں۔ عراق، شام، پاکستان، بحرین اور یمن میں اہلبیتؑ کے نام لیواؤں پر ہر سو یلغار ہے اور درندگی و دہشتگردی کا جا بجا ننگا ناچ ہے۔ خاصکر موساد، آئی ایس آئی اور وہابیت کی چھتر چھایا میں جنم لینی والی تنظیم داعش کی نظریں اب عتبات عالیات کی طرف لگی ہیں، جن کا وجود مقدس ان اموی اور عباسی ذہنیت کے حامل عناصر کے دلوں میں کھٹکتا ہے۔ لہذا ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اِن مشاہد مقدسہ کی تاریخ کی وسیع پیمانے پر تشہیر ہو۔ چونکہ کشمیری زبان کے مقابلے میں اردو زبان کا دائرہ بے حد کشادہ ہے لہذا گردش روزگار اور حالات وواقعات کی نزاکت دیکھکر اسی زبان کے نام ہی قرعۂ انتخاب نکلا۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب ۱۹۵۰ء کے عشرے میں لکھی ہے۔ اس میں قبل از اسلام بلکہ کلدانی دور سے لیکر بیسویں صدی کے نصف تک کی شہر کربلا اور حائر حسینی کی

ساری سرگذشت درج ہیں۔ معتبر اور مستند ماخذات کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ کب بخت نصر کلدانی نے اس شہر میں حیر بنوایا، پھر واقعہ کربلا تک اس شہر کی کیا کیفیت تھی، پھر شہدائے کربلا کا مدفن بننے کے بعد کون کون سے انقلابات یہاں رونما ہوئے اور کس دور میں اس پر کیا بیتی، کس کس حکمران نے حائر حسینیؑ اور روضہ مقدسہ کو تعمیر کیا اور کس کس نے تاخت وتاراج اور منہدم کروایا اس کتاب میں اس پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ البتہ بعض واقعات کا تکرار بدمزگی کا احساس دلاتا ہے۔ اس کوتاہی کے باوجود کربلائے معلیٰ اور حائر مقدس کی معلومات کے حوالے سے یہ کتاب واقعی ایک جامع انسائیکلوپیڈیا ہے۔

گذشتہ ساٹھ برسوں کے دوران شہر کربلا اور عتبات عالیات پر کیا گذری اُس کے تعلق سے یہ کتاب بلکل خاموش ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دہائیوں میں سرزمین کربلا نے حسن البکر اور صدام حسین وغیرہ جیسے بدنام زمانہ ڈکٹیٹروں کا پرآشوب دور دیکھا، ایران عراق جنگ، عراق کویت جنگ، امریکہ اور نیٹو ممالک کی بمباری اور بالآخر صدام کا زوال، جمہوریت کا آغاز اور پھر داعش کا ظہور دیکھا اور اب طالبان کی طرح اس گروہ پر بھی اپنے ہی خالقین کی بمباری دیکھ رہا ہے۔ ان دہائیوں میں کئی مرتبہ عتبات عالیات کو تخریبی کاروائیوں سے نقصان پہنچا، سامرا کے حرم مقدس کو دھماکے سے اڑادیا گیا۔ مدتوں تک زیارات پر پابندی عائد رہی اور عزاداری ممنوع قرار دی گئی تھی۔ لیکن وہ زمانہ بھی نہ رہا۔

میں مرزا ناصر علی صاحب کا بے حد ممنون ہوں جس کی حوصلہ افزائی اور مالی معاونت نے مجھے یہ کتاب ترجمہ کرنے کی تحریک وترغیب دلادی۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے اور انکے اور میرے اسلاف کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اسی طرح مفتی شفیق الرحمان اور مولوی نذیر احمد کے علمی تعاون کا شکریہ بھی بگردن ہے۔ اللہ کی مقدس بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ بپاس محمد وآل محمدؐ میری اس ادنیٰ کاوش کو شرف قبولیت بخشے۔ (آمین)

مقبول ساجد

پہلا باب

کربلائے معلّیٰ......ایک تعارف

جس شرف و امتیاز نے کربلائے معلّیٰ کو مسلمانوں کا کعبۂ ثانی نیز دانشوروں اور صاحبان فہم و ذکا کے لئے اسلامی تاریخ کے تمام ادوار میں قبلہ بنائے رکھا اور تا ابد اس کی یہی حیثیت قائم رہے گی وہ یہ ہے کہ اس سرزمین پر جگر گوشۂ رسولؐ امام حسینؑ محوِ آرام ہیں، جنہوں نے اسلام کے بنیادی اصول و مبادیٔ اور انسانی اقدار کی احیأ و بقا کی خاطر نہ صرف اپنی قربانی پیش کی بلکہ اپنا گھر و بار، فرزند، عزیز و اصحاب غرض ہر شے راہ حق میں نچھاور کیا۔

یہ ارضِ کربلا نہ صرف عرب و عجم میں بلکہ پورے عالم اسلام میں متواتر آسمانی نور بکھیر تا رہا اور اُنہیں جگمگاتا رہا۔ رہروانِ اسلام اس سے دینِ حق کے مبادیٔ و اصول تلاش کرتے ہیں اور غیر مسلم زندگی کا صحیح راستہ۔ یہ کربلا آج کے دن بقول اُستاد عباس محمود العقاد:

"یہ وہ مقدس اور محترم سرزمین ہے کہ جہاں مسلمان عبرت اور یاد تازہ کرنے کیلئے زیارت کو آتے ہیں جبکہ غیر مسلم مشاہدہ و نظر کیلئے۔ لیکن اگر اس سرزمین کے ساتھ انصاف سے کام لیا جائے تو اس کا حق ہے کہ یہ ہر اُس شخص کی زیارت گاہ قرار پائے، جو اپنے نبی کی عظمت و فضیلت کا چنداں قائل اور انسانی اقدار کا تھوڑا بہت بھی اعتراف کرتا ہو۔ ہمیں تو زمین کے کسی ایسے حصے کا علم نہیں جس کے نام کے ساتھ نوع انسانی کے سارے فضائل و مناقب کی وابستگی ہو۔ جس طرح حسینؑ کی شہادت کے بعد کربلا کا نام فضائل انسانی سے وابستہ ہو گیا۔

ہر وہ ملکوتی صفت جس کی وجہ سے انسان انسان ہے اور جس کے بغیر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں وہ تمام نمایاں اوصاف شہادت حسینؑ کی بدولت امر اور جاودان ہیں اور سرزمینِ کربلا پر اُن کا عملی ثبوت ملتا ہے۔

نوعِ انسانی کے جتنے بھی اعلیٰ اور روحانی اوصاف ہیں جیسے ایمان، قربانی، ایثار، بیداریٔ ضمیر، حق کو اولیٰ سمجھنا، احساس فرائض، مصیبتوں میں استقلال اور ثابت قدمی، ظلم وبربریت کے آگے سرخم نہ ہونا، موت کا مردانہ وار مقابلہ کرنا اور اسی قسم کے دیگر اعلیٰ صفات، وہ سب کربلا میں جب سے کہ حسینیؑ قافلہ یہاں آکر فروکش ہوا، جلوہ گر ہوئے۔

ارضِ کربلا کے سوا ایسے روشن اور تابندہ صفات نہ کسی سرزمین پر اکٹھا ہوئیں اور نہ کسی اور موقعے پر اس طرح جھلملا اٹھیں جس طرح کہ سانحہ کربلا میں ہوئیں۔[1]

کیونکہ اس ارضِ پاک پر ایسا دلدوز و روح فرسا سانحہ پیش آیا تھا جس نے مسلم اور غیر مسلم دونوں پر قیامت خیز اثر کیا، یہ ایسی سخت ترین مصیبت تھی جس نے تاریخ انسانی کی تمام اگلی اور پچھلی مصیبتیں فراموش کردیں کیونکہ یہ مصیبت قومی اور وطنی حدود ہی تک محدود نہیں رہی اور نہ کسی محدود دائرہ اور کسی خاص دور سے منسلک ہے بلکہ جس طرح آفتاب عالمتاب کی کرنیں کائنات کے چپے چپے تک جا پہنچتی ہیں اُسی طرح اس سانحہ سے کائنات کا گوشہ گوشہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا بقول انگریز مورخ گبنؔ کے:۔

''حسینؑ کے روح فرسا واقعۂ شہادت کو اگرچہ بہت سی صدیاں بیت چکیں ہیں اور باجودیکہ یہ ایک دور دراز ملک میں پیش آیا تھا شاید ہی کوئی بے حس وہواس اور شقی القلب انسان ایسا ہو جو اس واقعہ کو سُن کر کانپ نہ اٹھے اور اُس کا دل پسیج نہ جائے۔''[2]

اس بنیاد پر اگر تمام مقدس اسلامی شہروں میں صرف کربلا ہی کو ایسی شہرت نصیب

۱: ابوالشہد ا: عباس محمود العقاد مطبوعہ مصر ۲: تاریخ عرب: سید امیر علی ترجمہ ریاض رافت: ص ۴۷

ہوئی اور ہر دور میں لاکھوں کروڑوں حساس انسانوں کے دل اس کی طرف کھینچتے رہے ہوں
اور مسلمان عبرت حاصل اور یاد تازہ کرنے اور غیر مسلم نظر و مشاہدہ کے لئے اس کی زیارت
کو آئیں، تو یہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔ کربلا آج ایسی ہی زیارتِ گاہ عوام و خواص ہے،
مختلف ممالک کی مختلف قومیں و قبیلے اس کی زیارت کو آتے ہیں اور اس کی یہی حالت اُس
وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ روئے زمین پر اسلام کا نام و نمود باقی ہے اور جب
تک دُنیا میں انسانی اقدار اور عدل و حُریت کے حامی زندہ ہیں۔

تاریخ اسلامی میں کربلا کو دینی نکتہ نگاہ سے ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ بہت سے
لوگوں کی نظر میں اس کا رتبہ دیگر مقدس مقامات سے برتر ہے۔ یہ اسلئے کہ یہ ایسا خالص
اسلامی شہر ہے جو جاہلیت کی ظلمت و کثافت سے ہمیشہ پاک اور منزہ رہا۔ دورِ اسلام ہی
میں اس شہر کی داغ بیل پڑی اور اس کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس کی مٹی میں خون حسینؑ کی
آمیزش ہے، وہ حسینؑ جن کا خون رسول خداؐ کا خون جیسا تھا (لَحْمُکَ لَحْمِی دَمُّکَ
دَمِیْ ۔فرمان رسولؐ)۔ کربلا کو ایسا تقدس اور پاکیزگی حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ
میں بھی بہت اونچا درجہ رہا۔ علاوہ ازیں یہ اسلامی و علمی مراکز میں سے ایک بہت بڑے
مرکز کی حیثیت کا حامل رہا کہ ہر سال دنیا کے گوشے گوشے سے لاکھوں زائرین یہاں
زیارت کیلئے آتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود کربلا اور اُس کے قدیم و جدید مآثر حالات کے اسیر
رہے۔ اُسکے تاریخی حالات بہت کم کتابوں میں دستیاب ہیں اور جتنے بھی حالات ملتے ہیں
تو وہ دیگر واقعات و حوادث کے حوالے سے یا مختلف معاملات کے ذیل میں ملتے ہیں۔

مواد کی اس کمی کی وجہ سے ہم مجبور ہوئے کہ مختلف قلمی اور مطبوعہ تاریخوں سے اُس
کے مزید حالات جمع کریں۔ عوام کی امنگوں اور توقعات نے اس سلسلے میں میری حوصلہ
افزائی کی اور ہم سالہا سال کی محنت و کاوش کا ماحصل اپنے کرم قارئین کی خدمت میں

پیش کرر ہے ہیں۔ شکر اللہ کا کہ ہمیں کربلا کی مکمل تاریخ اور اُسکے تمام حالات معلوم کرنے کے وسائل اور سعادت نصیب ہوئی۔ بہرحال ہمیں مختلف کتابوں سے جو کچھ میسر ہو سکا اُس کو ہم ایک جگہ سمیٹ کر صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کا شرف حاصل کرر ہے ہیں۔

اس سے پیشتر کربلا کی جتنی بھی تواریخ قلمبند کی گئیں ہیں ان میں حائر اور حیر دونوں کو مخلوط کر دیا گیا ہے اور شہر کربلا اور قبر مطہر کو ایک کر دیا گیا ہے۔ جیسے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ ایک ہی سلسلۂ کلام میں کسی موقعے پر شہر کربلا کا ذکر ہے، کبھی حائر حسینیؑ کا۔ ویسے اس میں کوئی خاص مضائقہ تو نہ تھا اس لئے کہ جب شہر کربلا کی تاریخ لکھی جائے گی اس میں حائر حسینیؑ کی تاریخ خود بخود لامحالہ آہی جائے گی۔ لیکن ہم نے اپنے رسالہ میں شہرِ کربلا اور حائر حسینیؑ کے حالات الگ الگ لکھے ہیں۔ ہم نے شہر کربلا کی عام تاریخ کے عنوان سے علاحدہ بحث کی ہے۔ دورِ قدیم سے لیکر فتوحاتِ اسلامی اور واقعۂ کربلا تک کے الگ الگ حالات بیان کئے ہیں، نیز حائر مقدس اور ضریح مبارک کی تاریخ اور ان پر بارہ صدیوں میں جو انقلابات و سانحات بیت گئے، جو بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں، انہدام، تاراجی اور خاصکر اموی و عباسی سلاطین کے ادوار میں جو کچھ ان پر گذری وہ علاحدہ بیان کیا ہے۔

پہلی فصل

حائر کو دینی نقطہ نگاہ سے کیا عزّت واحترام اور تقدس حاصل ہے؟

اسلام کی رو سے ارضِ حائر سب سے زیادہ پاکیزہ سرزمین اور قدر و منزلت میں کعبہ کے ہم پلہ ہے۔ یہاں سے پوری کائنات میں ہدایت و حرّیت کی روشنی پھیلی، مشرق و مغرب تک اُس کا نور پھیلا۔ سرزمین کعبہ پر اس بنا پر اسے فوقیت حاصل ہے کہ یہ سرزمین

خالص اسلامی سرزمین ہے۔ اُس میں جاہلیت کبھی بھٹک نہ پائی، نہ ہی اس سرزمین پر اصنام اور غیر خدا کی کبھی پوجا پاٹ ہوئی۔ اس کی خاک میں رسولؐ خدا کا لہو ملا ہوا ہے، اُس کے ذرّات میں رسولؐ کے گوشت پوست کی آمیزش ہے۔ یہاں فرزند رسول حسینؑ مظلوم دفن ہیں جن کے گوشت پوست کو پیغمبر خداؐ نے اپنا گوشت پوست کہا ہے۔ ابتدائے اسلام سے تاریخ واحادیث میں ارضِ کربلا کا تذکرہ ہوتا رہا اور اس کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے مثلاً کربلا، غاضریہ، نینوا، عمورا، شاطی الفرات، شطِّ فرات۔ اسی طرح بعض روایتوں میں اِسے ماریہ، نوادیس، طف، طف فرات، مشہد حسینؑ، حائر اور حیر بھی کہا گیا ہے۔ بایں ہمہ اور بھی متعدد ناموں سے اس کو موسوم کیا گیا ہے۔ مگر ان تمام ناموں میں دینی حیثیت سے 'حائر' کو ہی زیادہ اہمیت حاصل رہی، کیونکہ یہ نام حرمت وتقدس کا جامہ زیب تن کئے ہوئے ہے یا اس نام سے روایت اور فقہ میں بہت سے اعمال واحکام مذکور ہیں مگر باجودیکہ حائر کو دینی حیثیت سے بڑی اہمیت وعظمت حاصل ہے مگر اب تک نہ تو تاریخی اور لغوی نکتہ نگاہ سے اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور نہ ہی فقہ وحدیث کی رو سے۔ ہم یہاں متقدمین ومتاٗخرین علمائے محدثین اور اربابِ لغت وتاریخ کے اقوال وآرا درج کرتے ہیں۔

دوسری فصل

''حائر'' لغت وتاریخ کی نگاہ میں

اس ارضِ مقدس کے جس پر تاریخ کا سب سے بڑا المناک سانحہ وقوع پذیر ہوا مختلف نام ہیں اور کسی فرق وامتیاز کے بغیر یہ سرزمین ان سبھی ناموں سے یاد کی جاتی رہی۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ اسے غاضریہ، نینویٰ، ماریہ، عمورا، نوادیس، شط الفرات، شاطی الفرات، طف، طف فرات، حائر، حیر اور کربلا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کربلا کا نام بھی

دیگر ناموں جیسا تھا یعنی اس نام کو پہلے کوئی خصوصیت نہ تھی۔ جس طرح یہ سرزمین بقیہ دوسرے ناموں سے یاد کی جاتی تھی بایں ہمہ کربلا کا نام بھی لیا جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس نام کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوتی گئی اور اب یہ سرزمین صرف اسی نام سے مشہور رہے۔ کربلا کے علاوہ دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسی سرزمین ہو جس کے اتنے زیادہ نام ہوں۔ ایک سرزمین کیلئے اتنے نام ہونا اور اس کثرت سے ہونا ایسی چیز نہیں کہ اُسے صرفِ نظر کیا جائے۔ ناموں کی اس کثرت کے کئی وجوہات واحتمالات ہو سکتے ہیں مثلاً یہ کہ بعض نام عام ہوں اور زیادہ وسیع علاقہ کو احاطہ کئے ہوں اور بعض خاص ہوں اور مختصر سے علاقہ کیلئے مخصوص ہوں جیسا کہ عموماً ہر مقام پر ہوا کرتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان مذکورہ ناموں میں بعض نام ہوں اور بعض صفات، مگر صفات کی شہرت بھی اتنی ہی ہوگئی جتنی نام کی ہوسکتی تھی۔

حائر اور حیر بھی ان بے شمار ناموں میں شامل ہیں جو ابتدائی دور سے اس جگہ کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ انتساب کے موقعے پر کربلا کے بجائے زیادہ تر حائر کا لفظ استعمال ہوتا تھا اور کربلا کے رہنے والے کو حائری کہا جاتا تھا۔ حائر اسم فاعل ہے۔ حار، یحیر، حیراً اسے عربی میں کہتے ہیں۔ 'تَحَیَّرُ الْماءِ' پانی ایک جگہ چکر کھا کر اکٹھا ہوگیا، 'تَحَیَّرَتْ الْاَرْضُ بِالْمَاءِ' زمین پانی سے بھر گئی۔ اس کی جمع حوران اور حیران دونوں آئی ہیں۔ ''حائر'' اس سطح مستوی کو کہتے ہیں جس کے کنارے اونچے ہوں۔ بالفاظِ دیگر ''حائر'' اس نشیبی جگہ کو کہتے ہیں جس کے اطراف وجوانب بلند ہوں، ایک گہرے حوض کی مانند جس میں بارش کا پانی جمع ہوجائے۔

اس نشیبی جگہ کو حائر اس وجہ سے کہا جانے لگا کہ جب ہوا چلتی ہے تو اُس کے پانی میں لہریں اُٹھ اُٹھ کر کنارے کی طرف جاتی ہیں اور چونکہ کنارہ اُونچائی پر ہوتا ہے تو وہ

لہریں پھر پلٹ آتی ہیں، اس طرح وہ حیران و ششدر رہ جاتی ہیں اور اُنہیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ کربلا کے بعض حصہ کو بھی شاید بہت پہلے سے ہی اسی لئے حائر کہا جاتا ہو کہ کربلا کی زمین میں بعض نشیبی زمینیں ہیں جہاں بارش کا پانی بہہ کر آتا تھا۔ آج کل بھی کربلا میں بعض ایسے حصے موجود ہیں اور وہاں کی مونسپلٹی ایسی نشیبی زمینوں کو اب تک پاٹ کر برابر نہ کر سکی۔

تمام رواۃ ومُحدّثین، ارباب لغت، ماہرینِ تاریخ وجغرافیہ اس بات پر متفق ہیں کہ کربلا کا نام حائر ہے۔ اخبارات وروایات سے عیاں ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے کربلا اسی نام سے مشہور تھا۔ "تاریخ طبری" میں اس کا ذکر حَیر کے نام سے آیا ہے اور حَیر اہلِ لغت کے نزدیک لفظ حائر کا مخفف ہے۔ (تاریخ طبری جلد: ۱ ص ۱۱۸)

مشہور جغرافیہ دان یاقوت حموی "معجم البلدان" میں رقمطراز ہیں:۔

"حائر قبر حسینؑ کا نام ہے"۔

بعدازاں آگے خامہ فرسا ہیں:۔

"جب کربلا کہنا ہوتا ہے تو لوگ مطلقاً لفظ حیر استعمال کرتے ہیں"۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ علامہ حموی کے نزدیک حائر اور حَیر میں فرق ہے۔ حائر قبر حسینؑ کو کہتے ہیں اور حَیر پورے کربلا شہر کو اور یہی صحیح بھی ہے۔ البتہ طبری کی مذکورہ روایت سے حَیر اور حائر میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔

صاحب "تاج العروس" کا بیان ہے:۔

"حائر اُس مقام کا نام ہے جہاں امام مظلوم وشہید ابو عبداللہ الحسینؑ کی قبر واقع ہے"۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام مظلومؑ کی قبر حائر کے وسط میں واقع ہے۔

"قاموس" میں بھی تقریباً یہی معنی لکھے گئے ہیں:۔

"حائر میں امام حسینؑ کی قبر ہے"۔

''مراصد الاطلاع'' میں یوں خامہ فرسائی ہوئی ہے:-

''حائر وہ جگہ ہے جہاں امام حسینؑ کی قبر ہے، اس لئے کہ آپ کی قبر نشیبی جگہ میں ہے، جس کے کنارے بلند ہیں''۔

طریحی ''مجمع البحرین'' میں اس طرح اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے:-

''حدیث میں حائر کا ذکر آیا ہے۔ حائر دراصل پانی جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد حائر حسینیؑ ہے اور یہ وہ جگہ ہے جسے روضۂ امام مظلومؑ کی چار دیواری محصور کئے ہوئے ہے''۔

''دائرۃ المعارف الاسلامیہ'' میں حائر کے تحت یہ رائے مرقوم ہے:-

''حائر اور حیر دونوں کربلا کے نام ہیں''۔

جہاں تک روایات و احادیث کا تعلق ہے تو اُن میں لفظِ حائر کبھی کربلا کے لئے مستعمل ہوا ہے اور کبھی خاص اُس جگہ کے لئے جہاں امام مظلومؑ کی قبر ہے۔

ان تمام اقوال، آرا اور بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ حائر اور حیر کربلا ہی کے دو نام ہیں۔ گو کہ کربلا کو کبھی حائر سے یاد کیا گیا اور کبھی حیر کے لفظ سے۔ البتہ ان تمام اقوال سے مندرجہ ذیل دو باتوں کا انکشاف نہیں ہوتا۔

(ا) کربلا کا نام حائر یا حیر کیوں پڑا؟

(۲) کربلا کا یہ نام کب سے پڑا۔ کیا یہ نام ظہورِ اسلام سے قبل بھی معرض وجود میں تھا یعنی جس دور میں یہاں ایرانیوں کا اقتدار قائم تھا اسی وقت سے یہ نام چلا آرہا ہے یا مسلمانوں کا راج قائم ہونے کے بعد یہ نام پڑا؟ اگر اسلامی حکومت میں داخل ہونے کے بعد یہ نام پڑا تو کیا مولا حسینؑ کی شہادت سے قبل یہ نام پڑ چکا تھا یا شہادت کے بعد پڑا؟

باوجودیکہ ان تمام باتوں کی تاریخی اہمیت تھی مگر کتابوں میں ان دونوں باتوں کی

طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اسی بنیاد پر ہم آج یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ حائرسرزمین کربلا کی صفت اور اُس کی طبعی حالت کا نام ہے جیسا کہ اہلِ لغت کہتے ہیں یا در حقیقت یہ اس عمارت کا نام ہے جو ضریح اقدس کے اردگرد بنائی گئی اور پہلی ہی عمارت بننے کے بعد اس کا نام حائر پڑ گیا۔

اگر حائرؔ زمین کربلا کی صفت ہے یعنی چونکہ سرزمین کربلا نشیب میں واقع ہے اس لئے اُس کو حائر کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نہ صرف واقعۂ کربلا کے وقوع پذیر ہونے کے قبل ہی سے یہ اس کا نام چلا آرہا ہے بلکہ فتوحات اسلامیہ کے پہلے سے جبکہ یہ سرزمین مملکت ایران میں شامل تھی، لیکن اس بات کا آج تک کوئی ثبوت نہ مل سکا ہے کیونکہ اسکی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ نیز اگر ضریح اقدس کے اِردگرد عمارت بننے کے بعد اس عمارت کا نام حائرؔ پڑا تو اسکے یہ معنی ہوئے کہ شہادت امام حسینؑ کے بعد اس سرزمین کا نام حائر پڑا۔

تیسری فصل

’’حائر‘‘ فقہ اور احادیث کی روشنی میں

(ا) ’’حائر‘‘ کے حدود اور پیمائش

اگر حائرؔ کے لغوی اور اصطلاحی معنی مدنظر رکھے جائیں یعنی نشیبی جگہ تو اس کے حدود کی تعین اور پیمائش انتہائی مشکل ہے کیونکہ یہ سرزمین کئی مرتبہ آباد ہوئی اور کئی مرتبہ اُجڑ گئی۔ ظاہر ہے کہ بار بار بننے اور اُجڑنے میں کہیں نشیبی جگہ بھر گئی ہوگی اور جہاں کہیں نشیب نہ ہوگا وہاں نشیب ہو گیا ہوگا اور اگر عرفی معنی لئے جائیں تو اس کی حد بندی اور پیمائش میں ہمیں اخبار و احادیث کا سہارا لینا پڑے گا۔

اِن روایات واحادیث میں اگر چہ کافی اختلافات ہیں مگر یہی تاریخی دستاویزات اور ماخذات کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک محقق کو بوقت ضرورت ہر حال میں اُنہیں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اسلئے کہ یہی روایات واحادیث حائر کے حدود متعین کر سکتے ہیں اور گذشتہ ادوار میں عرفاً اور عادتاً جس خطہ پر اس کا اطلاق ہوسکتا تھا اُس کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔

ہم ان روایات واخبارات کا ذیل میں خلاصہ درج کرتے ہیں:-

راویوں نے حرم اور حائر کے درمیان باضابطہ میں فرق کیا ہے۔ اُن کے مطابق حآئر کے حدود کا تعین حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی دو روایتوں سے ہوتا ہے:-

''قبر امام حسینؑ سے ۲۰ ہاتھ مشرق، ۲۰ ہاتھ مغرب، ۲۰ ہاتھ شمال، ۲۰ ہاتھ جنوب ساری زمین حآئر میں شامل ہے''۔

بایں ہمہ عبداللہ بن سنان کی روایت میں مذکور ہے کہ:-

''امام حسینؑ کی قبر سے ۲۰ ہاتھ مشرق، ۲۰ ہاتھ مغرب، ۲۰ ہاتھ شمال، ۲۰ ہاتھ جنوب کی زمین باغ ہے۔ یہ جنت کے باغوں میں سے ہیں'' (مزار البحار، ص: ۱۴۱، کامل الزیارت، ابن قولویہ ص ۲۷۲، الحدائق الناضرہ، شیخ یوسف بحرینی جلد: ۳، ص ۳۴۵ طبع ایران)

اور بعض روایات میں ۲۰ ہاتھ کی جگہ ۲۵ ہاتھ لکھا گیا ہے۔ اسی طرح اسحاق بن عمار نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ امامؑ نے فرمایا:-

''کیا تمہیں قبر حسینؑ کی حرمت معلوم ہے جو فرد اسکی شناخت کر کے وہاں پناہ لے، اُسے پناہ حاصل ہے۔ میں نے عرض کی میں آپ پر واری، قبر حسینؑ کا تعیّن فرما دیجئے۔ امامؑ نے فرمایا قبر کی جگہ ۲۵ ہاتھ پیر کی جانب پیمائش کرو، ۲۵ ہاتھ چہرے کی طرف ناپو، ۲۵ ہاتھ پشت کی جانب اور ۲۵ ہاتھ سر کی جانب اور آپ کے قبر کی جگہ۔ جس دن سے کہ آپ مدفون ہوئے ایک باغ ہے جو جنت کے باغوں

میں سے ہے اور اسی مقام سے زائروں کے اعمال کو آسمان پر معراج ہوتی ہے"۔

(کامل الزیارت ابن قولویہ: ص۲۷۲، مزار البحار: ص۱۴۰، نزہتہ اہل الحرمین: ص۲۴)

ان دو روایتوں کے مطابق اگر ہم ایک ہاتھ کو کم و بیش آدھا میٹر فرض کریں تو اس بنیاد پر تقریباً ۶۲۵ میٹر مربع زمین حائر میں شامل ہے۔ یہ پیمائش علامہ محمد ابن ادریس حلیؒ المتوفی ۵۹۸ھ ہجری کی پیمائش کے مطابق ہے، وہ اپنی کتاب "السرائر" میں لکھتے ہیں:۔

"حائر سے مراد وہ سرزمین ہے جو روضۂ امام حسینؑ اور وہاں تعمیر شدہ مسجد کے چہار جانب واقع ہے۔ اصل میں یہی سرزمین حائر ہے اس لئے کہ لسان العرب میں حائر اس نشیبی زمین کو کہتے ہیں جس میں پانی چکر کھا کر رہ جائے"۔

(مزار البحار، ص۱۴۲، حدائق الناضرہ، شیخ یوسف بحرینی جلد۲: ص۳۴۵، کتاب الصلوٰۃ، کتاب السرائر)

(۲) حرم اور حائر

حرم جیسا کہ احادیث و روایات میں مذکور ہے، حائر سے بہت زیادہ وسیع زمین ہے کیونکہ یہ بہت بڑے خطے پر محیط ہے کہ جس کے درمیان حائر پڑتا ہے۔ حائر کے چہار اطراف ایک ایک فرسخ بڑھ کر حرم ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ چار فرسخ علاقہ پر مشتمل سرزمین حرم میں شامل ہے جس کے بیچوں بیچ قبر حسینیؑ واقع ہے۔ چنانچہ محمد ابن اسماعیل نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

"حرم، قبر حسینؑ کے چاروں سمت ایک ایک فرسخ کی زمین پر مشتمل ہے"۔

(کامل الزیارت: ص۲۷۲، البحار ص۱۴۰ حدائق الناضرہ جلد۲ ص۲۴۵)

دوسرے قول کے مطابق چار فرسخ مربع علاقہ حرم پر مشتمل ہے

جبکہ تیسرے قول کے مطابق قبر مطہر کے چہار اطراف کا پانچ پانچ فرسخ کا علاقہ حرم پر مشتمل ہے۔

منصور ابن عباس نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ:

"حرم قبر حسینؑ، قبر کے چاروں جانب پانچ فرسخ اراضی پر مشتمل ہے۔"

(کامل الزیارت ص ۲۷۳، مزار البحار ص ۱۴۱، حدائق الناضرہ جلد ۲: ص ۲۱۵)

مگر بعض علماء کے نزدیک یہ اقوال ضعیف ہیں۔ اُن کی آراء کے مطابق قبر حسینؑ کے چہار اطراف فقط ۲۵۔۲۵ ہاتھ اراضی حائر ہے جیسا کہ علامہ ابن ادریسؒ نے لکھا ہے:۔

"حائر سے مراد وہ خطۂ اراضی ہے جو روضۂ اقدس کی چار دیواری اور اس میں تعمیر شدہ مسجد کو احاطہ کئے ہوئے ہے، یہی چار دیواری علامۂ ابن ادریسؒ المتوفی ۵۹۸ھ کے زمانہ میں بھی قائم تھی۔ یہ وہی چار دیواری ہے جسے ابن سہلان رام ہر مزوزیر سلطان الدولہ بویہ الدیلمی نے حائر حسینیؑ کی آتشزدگی کے بعد ۴۰۷ھ میں تعمیر کرایا تھا، جو دو بڑی شمعوں کے ضریح پر گر پڑنے کی وجہ سے پورے حائر حسینیؑ میں پھیل گئی تھی اور پوری عمارت جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی تھی"۔

غرض کہ حائر کے حدود تعین کرنے کے لئے ہر حال میں اس کے اوّلین زمانۂ تعمیر کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور ان روایات کو ضرور پیش نظر رکھنا پڑے گا جو امام جعفر صادقؑ سے منسوب ہیں۔

علاوہ ازیں اربابِ لغت نے حائر کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے کہ وہ نشیبی زمین جس میں پانی چکر کھا کر رہ جائے۔

(۳) حرم اور اُس کے حدود کی پیمائش

راویوں کے نزدیک حرم اور حائر میں بظاہر فرق پائی جاتی ہے۔
حرم اُس خطے کا نام ہے جو اپنی پاکیزگی کے سبب جائے اُنس ہے جیسا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ:۔

حَرَمَةُ قَبْرُ الْحُسَيْنِؑ فَرْسَخٌ مِنْ اَرْبَعَةِ جَوَانِبُ

(قبر امام حسینؑ کے چہار جانب ایک ایک فرسخ کا علاقہ قبر حسینؑ کا حرم ہے۔)
یا یہ کہ قبر حسینؑ کے چاروں طرف پانچ پانچ فرسخ کا علاقہ حرم میں شامل ہے۔ لیکن یہ وسیع علاقہ بہر حال حائر کے حدود سے خارج ہے۔
بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ حرم اصل میں ۱۶ مربع میل کے علاقے پر مشتمل ہے جو امامؑ مظلوم نے وارد کربلا ہونے کے بعد ساٹھ ہزار درہم کے عوض باشندگان غاضریہ سے خرید لیا تھا اور یہ علاقہ اس شرط پر اُن ہی لوگوں کے حوالے کر دیا تھا کہ جو لوگ آپ کی زیارت کو آئیں تین روز تک ان کی ضیافت کا اہتمام اور قبر تک اُن کی رہنمائی کریں۔
چنانچہ محمد بن احمد بن داؤد قمیؒ نے ''کتاب الزّیارت'' میں اور علامہ بہائی نے ''کشکول'' میں یہ حدیث نقل کی ہے:۔

''بیان کیا جاتا ہے کہ امام حسینؑ نے باشندگانِ نینویٰ و غاضریہ سے اپنے قبر کے گرد و نواح کی اراضی ساٹھ ہزار درہم کے عوض خرید لی اور پھر یہ زمین اس شرط پر اُنہیں کے حوالے کر دی کہ ہمارے زائرین کی ہماری قبر تک رہنمائی کرنا اور تین دن تک اُنکی ضیافت کا اہتمام کرنا'' (کشکول شیخ بہائی ص ۱۰۳ طبع مصر)

پھر اسی روایت کے سلسلے میں علامہ بہائی نے اراضی کی پیمائش بتائی ہے اور لکھا ہے:

"یہ امام حسینؑ کا حرم ہے جیسا کہ امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ امام حسینؑ کا حرم ۱۶ مربع میل کے رقبے پر مشتمل ہے۔ یہ آپ کی اولاد اور آپ کے دوستوں کے لئے حلال اور مخالفین پر حرام ہے اور اس حرم میں خیر و برکت ہے۔

امام حسینؑ کے اس خطۂ اراضی کو وقف کر دینے کے بعد اس زمین کے اولادِ امام مظلومؑ اور آپکے دوستوں کیلئے حلال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ باشندگانِ غاضریہ و نینوا نے ان شرائط کو پورا نہیں کیا، چنانچہ علامہ ابن طاؤس نے محمد بن داؤد سے ایک روایت نقل کی ہے کہ سید طاؤسؒ نے بیان کیا کہ یہ خطۂ اراضی وقف کر دینے کے باوجود امام حسینؑ کی اولاد اور آپکے شیعوں کیلئے اسلئے حلال ہوئی کہ باشندگانِ غاضریہ و نینویٰ نے ان شرائط کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ (کشکول بہائی ص ۱۰۳)

بعض لوگوں کے خیال میں حرم میں وہ تمام زمین شامل ہے جو کربلا کی سرزمین سے ملحق اور جس میں حضرت امام حسینؑ کے خون کی آمیزش ہے اور اس خون کی آمیزش ہی کی بدولت اس سرزمین کو یہ حرمت نصیب ہوئی۔

بہر حال رواۃ و محدثین نے حرم اور حائر میں جو فرق کیا ہے اس کی کوئی تاریخی علت نہیں بلکہ اس کا سبب فقہی مسئلہ ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ مسافر زائرین کو چار مقامات پر اختیار ہے کہ چاہیں تو نماز قصر پڑھیں، چاہیں تو پوری پڑھیں۔ بعض علماء نے پوری نماز پڑھنے کو واجب قرار دیا ہے۔ مکہ اور مدینہ کے متعلق علماء کا اجماع و اتفاق ہے کہ وہاں پہنچ کر مسافر کو پوری نماز پڑھنا چاہیے۔ مکہ کیلئے تو یہ حکم ہے کہ پورے شہر مکہ میں نماز پوری پڑھی جائے۔ یہ اس لئے کہ مکہ معظمہ پورا حرم خداوندی متصور کیا جاتا ہے اور مدینہ منورہ میں خاص مسجد نبویؐ کے اندر پوری نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ لیکن مسجد کے ان ہی حدود میں جو

قدیمی ہیں یعنی حضرت رسولؐ خدا کے زمانہ میں جتنے قطعہ ٔ زمین پر مسجد بنی تھی بس اتنے ہی حصہ پر پوری نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ بعد ازاں جو اضافے مختلف خلفأ وسلاطین بنی اُمیہ وغیرہ کے ادوار میں معرض وجود میں آئے اُن کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ ٔ منورہ کو یہ نمایاں خصوصیت اس بنیاد پر حاصل ہے کہ ان مقامات پر پہنچ کر ایک مسلمان گویا اپنے ہی گھر اور وطن میں ہوتا ہے۔ یہ دونوں جگہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کی ملکیت ہیں۔

دو مقامات پر مسافر کو اختیار ہے کہ چاہے پوری نماز پڑھے یا چاہے تو قصر کرے۔ ایک مسجد کوفہ میں دوسرے حائر حسینیؑ میں۔ لیکن پوری نماز پڑھنا ہی بہتر ہے۔

اسی مسئلہ کی تشریح وتوضیح کے پیش نظر فقہاء مجبور ہوئے کہ اپنی تالیفات میں حائر کے حدود کے تعلق سے بحث کریں، وہ بھی ان روایات کی روشنی میں جو اس بارے میں وارد ہوئے ہیں۔ غرضیکہ رواۃ ومحدثین نے حائر کی حد بندی اور اُس کے حدود کی تعین وتشخیص میں اس درجہ جو کدوکاوش کی ہے اس کی وجہ محض فقہی مسئلہ ہے تاکہ ان حدود سے کہیں تجاوز نہ ہونے پائے جو امام جعفر صادقؑ کے دور میں اس کے حدود تھے۔ فقہأ ومُحدثین کی طول وطویل بحثوں سے عیاں ہوتا ہے کہ حائر اور حیر کو لوگوں نے خلط ملط کر دیا تھا یعنی لوگ اس غلط فہمی میں پڑ گئے تھے کہ حائرؔ اور حیرؔ دونوں ایک ہی چیز ہیں لہٰذا جو حائرؔ کا حکم ہے وہی حیرؔ کا بھی۔ یہ غلط فہمی ابتدأ عوام الناس میں پیدا ہوئی پھر چھٹی صدی ہجری کے آخر تک یہ اشتباہی کیفیت باقی رہی یہاں تک کہ علامہ ابن ادریسؒ نے ۵۸۸ھ ہجری میں اپنی کتاب السرائرؔ کے باب الصّلواۃ میں حائر اور حیرؔ لفظوں میں تفریق فرمائی۔ آپ کا ارشاد یوں ہے:-

اَلْمُرَادُ بِالْحَائِرِ دَارَ عَلَیْهِ سُوْرُ الْمَشْهَدِ

(حائر سے مراد وہ قطعہ اراضی ہے جسے روضہ کی چہار دیواری احاطہ کئے ہوئے ہے)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابن ادریسؒ کے دور تک لوگ حائرؔ و حیرؔ ایک ہی چیز سمجھتے تھے اور قبر مُطہّر اور شہر کے مابین کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ اسی فرق نہ کرنے کے باعث حائرؔ کے لئے جو احکام مخصوص ہیں وہ شہر کربلا کے لئے بھی تصور کرتے۔ اسی لئے ابن ادریسؒ کو ضرورت محسوس ہوئی کہ دونوں کے مابین جو فرق ہے وہ بیان کردیں۔

(۴) حائر کی حد بندی کے متعلق متاخرین کا اختلاف

متاخرین علماءؒ کی نگارشات سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ ابن ادریسؒ کی وضاحت کے باوجود یہ اشتباہی کیفیت بعد میں بھی برقرار رہی۔ حائرؔ اور حیرؔ کا ایک حکم سمجھا تا رہا اور حائر کو اصلی حدود میں محدود سمجھنے کے بدلے اس سے وسیع تر علاقہ پر محیط قرار دیا جاتا رہا۔ اس سلسلے میں علماء کے لاتعداد اور متضاد اقوال ہیں۔ کسی نے کچھ کہا ہے اور کسی نے کچھ۔ مگر ان گنت اقوال کے باوجود آج کل کے علماء نے توقف سے کام لیا ہے۔ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ حائرؔ کے حدود جس حد تک یقینی ہیں اور جس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں بس اتنی ہی جگہ پر مسافر زائر کو اختیار ہے کہ نماز پوری پڑھے یا قصر کرے۔

شیخ جعفر تستریؒ جو تیرھویں صدی کے فقہاء میں انتہائی نمایاں اور ممتاز شخصیت کے حامل ہیں نے تمام علماء کے اقوال کا تذکرہ کرنے کے بعد ترجیح اسی کو دی کہ قصر و اتمام کا اختیار فقط روضہ مُقدسہ کے اندر ہے چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:۔

''ہمارے علماء نے حائرؔ کی حد بندی کے تعین میں اختلاف کیا ہے۔ ابن ادریسؒ نے فرمایا کہ حائر سے مراد وہ قطعۂ اراضی ہے جسے روضۂ مقدس کی چار دیواری احاطہ کئے ہوئے ہے۔ بعض دوسرے علماء کا قول ہے کہ حائر میں روضہ کا پورا صحن شامل ہے۔ ایک اور قول یہ ہے کہ حائر بس اتنا ہی حصہ ہے جتنے پر قُبّہ بنا ہوا

ہے۔ایک قول یہ ہے کہ حائر میں روضۂ اقدس اور قدیمی عمارتیں بھی شامل ہیں یعنی رواق، مقتل، خزانہ وغیرہ۔ مجلسیؒ کا قول یہ ہے کہ قدیمی صحن کا مجموعہ حائر ہے ۔شاہان صفویہ نے اپنے عہد حکومت میں صحن میں جو اضافے کئے وہ حائر میں شامل نہیں۔غرض کہ اسی طرح کے اور بہت سے اقوال ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ حائر کی حقیقی حد بندی کسی کو نہیں معلوم۔ احوط یہی ہے کہ روضۂ اقدس پر اکتفا کی جائے (یعنی نماز کے قصر واتمام کو بس روضۂ اقدس کے اندر ہی محدود سمجھا جائے)'

(کتاب خصائص الحسینؑ صفحہ ۱۹۰و۱۹۱ شیخ تستریؒ المتوفی ۱۳۰۲ھ مطبوعہ ایران)

چونکہ علامۂ تستریؒ کے نزدیک حائر کی حقیقی حد بندی آج تک یقینی طور پر معلوم نہ ہوسکی لہٰذا ان کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ بس اسی حد تک اکتفا کی جائے جس میں کسی کو اختلاف نہیں یعنی روضۂ مقدسہ یعنی حرم شریف کا اندرونی حصہ۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے دور میں جو حائر کے حدود متعین کئے تھے یقینی طور پر اتنا ہی حصہ حائر ہے اور اتنے ہی حصہ میں ایک مسافر کو اختیار ہے کہ خواہ نماز قصر کرے خواہ اتمام کرے۔

چوتھی فصل

حرم اور حائر کے علاقے اور اُن کے درجات فضیلت وشرف

حرم سے مراد وہ حرم نہیں جو عموماً زبان زدعام وخاص ہے یعنی روضۂ پاک کا اندرونی حصہ بلکہ اس سے مراد وہ علاقے ہیں جن کے متعلق روایات میں وارد ہوا ہے کہ قبر مطہر کی وجہ سے یہ علاقہ محترم ومحتشم ہے اور اقوال معصومینؑ سے اُن کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔یہ علاقے وسعت اور کشادگی کے لحاظ سے مختلف ہیں۔سب سے زیادہ محترم اور

مقدس جگہ وہ مختصر اور محدود دائرہ ہے، جس دائرہ میں قبر حسینیؑ واقع ہے یعنی قبر حسینیؑ کے ۲۰۔۲۰ ہاتھ چاروں طرف۔ پھر اس سے بڑا دائرہ قبر سے ۲۵۔۲۵ ہاتھ چاروں طرف۔۔ پھر اس سے بھی بڑا دائرہ جو قبر کے چاروں طرف ایک ایک فرسخ زمین پر مشتمل ہے۔ پھر اس سے بڑا دائرہ جو قبر حسینیؑ کے چاروں طرف چار چار میل کے علاقہ پر مشتمل ہے۔ پھر اس سے بڑا دائرہ جو قبر حسینیؑ کے چاروں طرف چار چار فرسخ پر مشتمل ہے۔ پھر اس سے بڑا دائرہ جو قبر حسینیؑ کے چاروں طرف پانچ پانچ فرسخ کے علاقہ پر مشتمل ہے۔ غرض کہ مختلف احادیث وروایات میں حرم کے جیسے جیسے حدود اور پیمائشیں مذکور ہیں۔ ان روایتوں کی بنیاد پر سارے دائرے حرم میں داخل سمجھے جائیں گے۔ لیکن یہ تمام دائرے شرف وفضیلت میں حائر کے برابر نہیں اس لئے کہ حرم کا دائرہ جتنا بڑھتا جائے گا اتنا ہی حائر اور نقطہ مرکزی یعنی قبر حسینیؑ سے اس کی مسافت دور ہوتی جائے گی اور جتنی مسافت دور ہوتی جائے گی اتنا ہی شرف وفضیلت کم ہوتی جائے گی اور اس کے برعکس جتنا دائرہ چھوٹا ہوتا جائے گا اتنا ہی شرف وفضیلت بڑھتی جائے گی۔

اس بارے میں علامہ مجلسیؒ بحار الانوار میں کتاب المصباح سے منقول ہیں:-

''ان احادیث کی رو سے ان مقامات کو فضل وشرف کے درجات حاصل ہیں، بعید ترین علاقہ حرم کا پانچ فرسخ کا ہے اور قریب ترین علاقہ قبر مطہر سے ایک فرسخ کا ہے اور ایک فرسخ سے بھی زیادہ اشرف وافضل قبر مطہر سے ۲۵ ہاتھ چہار جوانب کی سرزمین ہے اور ۲۵ ہاتھ سے بھی زیادہ اشرف وافضل قبر مطہر سے ۲۰۔۲۰ ہاتھ چاروں اطراف کی سرزمین ہے''۔

گویا کہ قبر حسینیؑ سے جو زمین جتنی قریب ہے اس کا درجہ اتنا ہی بلند ہے اور جو زمین جتنی دور ہے اس کا فضل وشرف اتنا ہی کم ہے۔ اس بنا پر حائر کی جو زمین قبر مطہر سے ۲۰۔۲۰ ہاتھ

کے فاصلے تک ہے، وہ پورے خطے میں سب سے بلند مرتبہ اور فضل وشرف کی حامل ہے۔

اسلام میں فقط کربلائے معلیٰ ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے۔ یہ شرف ومنزلت کسی اور زمین کا کیا ذکر مکہ معظمہ کو بھی حاصل نہیں اور غالباً اس کا سبب وہی ہے جو ہم پہلے قلمبند کر چکے ہیں یعنی کہ سرزمینِ کربلا میں خون حسینؑ کی آمیزش ہے۔

گو کہ کربلا کا پورا علاقہ پاک وپاکیزہ اور محترم ومحتشم ہے۔ اگر چہ قبر حسینیؑ سے نزدیکی اور دوری کے لحاظ سے اس سرزمین کے درجات میں فرق ہے مگر پھر بھی کربلا کے اس پورے خطے پر حرم کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ کلینیؒ کی وہ روایت بتاتی ہے جو انہوں نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے آپ نے فرمایا:-

''جب تم امام حسینؑ کی زیارت کو آؤ تو پہلے فرات میں غسل کرو، پاک وپاکیزہ لباس پہنو، پھر برہنہ پا روانہ ہو کیونکہ اس وقت حرم ہائے خدا اور رسولؐ میں سے تم ایک حرم میں ہوں گے۔''

بہر حال یہ امر واقع ہے کہ حائر کا احاطہ بہت محدود ہے جیسا کہ اس روایت سے عیاں ہوتا ہے کہ حائر کے اصلی حدود وہی ہیں جن حدود میں سب سے پہلی عمارت قبر حسینیؑ پر تعمیر ہوئی تھی۔ اس عمارت میں زیبائش وآرائش تو کچھ نہ کچھ برابر ہوتی رہی مگر عمارت میں اضافہ نہیں ہوا، وہ اُن ہی حدود تک حضرت امام جعفر صادقؑ کے دور تک قائم رہی۔ اس سلسلے میں متعدد طریقوں سے بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں حائر مقدس کی حد بندی مذکور ہے کہ قبر حسینیؑ سے ۲۰-۲۰ ہاتھ یا ۲۵-۲۵ ہاتھ چاروں طرف کی زمین حائر ہے۔

مختصر یہ کہ روایات واخبارات سے واضح ہوتا ہے کہ حائر نام ہے اس عمارت کا جو قبر مطہر کے گرد واقعہ کربلا کے بعد پہلی مرتبہ بنی۔

❁❁❁

دوسرا باب

پہلی فصل

حآئر اور حیر کی تاریخی تحقیق

سابقہ صفحات میں حآئر اطہر کے مختلف زاویوں پر بحث و تمحیص ہوئی، اب ایک بات یہ باقی رہ جاتی ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے روضۂ اقدس کو کب سے حآئر کہا جانے لگا۔ اس باب میں ہم اسی کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں۔ واقعۂ کربلا سے پہلے نہ تو کسی حدیث ہی سے پتہ چلتا ہے کہ کربلا کو حآئر کہا جاتا ہو اور نہ ہی تاریخ سے اس کا کوئی سراغ ملتا ہے۔ واقعہ کربلا کے بعد بھی ایک مدت تک اِسے حائر یا حیر کی لفظ سے نہیں پکارا گیا۔

حضرت رسول خداؐ کی وہ احادیث جن میں پیشگوئی کی گئی ہے کہ حسینؑ سرزمین کربلا پر قتل کیئے جائیں گے، اُن میں حائر کے بغیر کربلا کے سبھی نام مذکور ہیں۔ بعض احادیث میں کربلا کا نام آیا ہے، کسی میں نینویٰ کا، کسی میں طفؔ کا، کسی میں شط الفراتؔ یا شاطی الفرات۔ مگر ایک حدیث بھی ایسی نہیں جس میں حآئر یا حیؔر نام لیا گیا ہو۔ دورِ نبوت کے بعد بھی ہم حائر نام کا کوئی وجود نہیں پاتے۔ چنانچہ جس حدیث میں ذکر ہے کہ صفین جاتے ہوئے جناب امیر المومنینؑ کربلا میں ٹھہرے اور حسینؑ کی شہادت کو یاد کر کے آپ بھی روئے اور آپ کے اصحاب بھی اشکبار ہوئے، اس حدیث میں بھی حآئر یا حیؔر نام مذکور نہیں۔

جب ہم تاریخ کے جھروکوں میں ایک بار پھر جھانکتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ

خاص واقعۂ کربلا سے قبل دو محرم کو جب امام مظلومؑ اس علاقے میں وارد ہوئے اور ایک ایک سے گاؤں کا نام پوچھے تو لوگوں نے مختلف نام بتائے۔ نینویٰ، غاضریہ، شفیہ، عقر، کربلا وغیرہ جیسے سبھی نام لئے گئے لیکن حائر یا حیر نام کسی بھی فرد نے نہیں لیا۔

بایں ہمہ دوم محرم کو کہ جس روز امام حسینؑ وارد کربلا ہو گئے اور یہاں قیام شروع کیا سے لے کر شہادت تک کے جو واقعات تاریخوں میں مرقوم ہیں اُن میں بھی حائر کا ذکر کیا اس نام کے تعلق سے ایک ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ پھر حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد اہل حرم کی گرفتاری، اُن کا کوفہ لے جانا، وہاں سے شام جانا، پھر شام سے واپسی اور مدینہ جاتے ہوئے کربلا سے اُن کا گذر، ان واقعات میں بھی حائر کا نام مذکور نہیں۔

پس جب ہم تاریخ کو یکسو چھوڑ کر احادیث پر غور کرتے ہیں تو حضرت امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ نے قبر حسینؑ اور اس کی زیارت کے جو فضائل بیان کئے ہیں اُن میں بھی حائر یا حیر لفظ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ ۱۱۴ھ میں حضرت امام محمد باقرؑ کی وفات ہوئی اُس وقت تک تاریخ میں حائر یا حیر کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ پھر حائر نام کب پڑا؟ اس تعلق سے وثوق سے کسی ماہ و سال کا تعین کرنا محال ہے، فقط قرائن اور قیاس آرائیوں کی بنیاد پر ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ حائر نام پڑا بھی ہوگا تو شاید ۱۱۴ھ کے بعد ہی پڑا ہوگا۔

اسلئے اگر کربلا کا نام حائر اس کے جغرافیائی یا طبعی حالات کی بنیاد پر ہوتا تو لازمی تھا کہ یہ نام امام حسینؑ کی شہادت ہی سے نہیں بلکہ ظہورِ اسلام کے قبل سے ہی رائج ہوتا، کیونکہ اس دور میں یہ سرزمین بنجر اور باشندگان سے مبرا تھی اور تاریخ و احادیث دونوں میں حائر کا لفظ موجود ہوتا۔ حالانکہ اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ کربلا کا نام حائر بنی اُمیہ کے آخری دور اقتدار میں پڑا۔ اس سے قبل کسی کو علم بھی نہ تھا کہ کربلا کا نام حائر بھی ہے۔ گو کہ نہ دورِ جاہلیت میں اس کا یہ نام رہا نہ عصرِ رسالت میں۔ نہ واقعۂ کربلا کے وقت نہ

حضرت امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ کے ادوار میں۔ غرض کہ پہلی صدی ہجری سے لیکر دوسری صدی ہجری کے آغاز تک کربلا کا نام حائر نہیں پڑا تھا۔ آثار و روایات کو ٹٹولنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ کربلا معلیٰ کو سب سے پہلے ۱۲۵ھ میں حائر کے لفظ سے موسوم کیا گیا جیسا کہ حسین ابن بنت ابی حمزہؒ کی روایت سمیت بعض دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے جو حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہیں۔ اس موقعے پر قدرتی طور پر یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے دور میں کربلا کا نام حائر کیوں پڑا؟

دوسری فصل

حائر اور اس نام کی ابتدا

جس واقعے کو تیرہ سو سال بیت چکے ہوں اس کے متعلق آج کوئی فیصلہ کرنا آسان بات نہیں، لیکن تاریخ ایک ایسی چیز ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ جب ہم امام جعفر صادقؑ کے دور کا مفصل جائزہ لیتے ہیں اور اُن احادیث کا جو آپ سے سُنی گئیں یا دوسروں کے ذریعہ نقل ہوئیں تو پتہ چلتا ہے کہ آپ ہی کے دور میں پہلی بار کربلا کو حائر اور حیر کے ناموں سے موسوم کیا گیا اور اُسی دور سے ان دونوں ناموں کی اتنی تشہیر ہوگئی کہ تاریخ و حدیث سب ہی میں یہ دونوں نام کربلا کے لئے مستعمل ہونے لگے۔ لیکن بایں ہمہ یہ بھی حقیقت ہے کہ کربلا اور روضۂ حسینیؑ کے لئے حائر اور حیر کی شہرت آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوئی۔ پہلے یہ دو نام صرف اُن چند احادیث میں استعمال ہوئے جو امام

جعفر صادقؑ سے زیارت امام مظلومؑ کی فضیلت میں وارد ہوئیں۔ لیکن سبھی احادیث میں حائر اور حیر کی لفظیں استعمال نہیں ہوئیں ہیں۔

گویا کہ روضۂ حضرت امام حسینؑ کے لئے حائر اور حیر ناموں کی ویسی شہرت نہیں ہوئی تھی جیسا کہ دوسری صدی ہجری بیت جانے کے بعد ہوئی جیسا کہ حسین ابن بنت حمزہ ثمالیؒ نے اپنی حدیث میں بیان کیا ہے کہ میں بنی امیہ کے دور اقتدار کے آخری برسوں میں کوفہ سے پاپیادہ زیارتِ امام مظلومؑ کے لئے گیا۔ حسین ابن بنت ابی حمزہ ثمالیؒ کی اس حدیث میں بار بار حائر کا نام استعمال ہوا ہے۔ قرائن کے مطابق یہ حدیث دوسری صدی ہجری کا چوتھائی حصہ گذر جانے کے بعد کی ہے یعنی بنی امیہ کی حکومت ختم ہونے سے پہلے کی ۱۳۲ھ میں بنی اُمیہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا، لیکن امام مظلومؑ کی قبر کو حائر کی لفظ سے اُس وقت سے یاد کیا جانے لگا جبکہ قبر مبارک پر قبہ اور سائبان بن چکا تھا۔ پھر اس عمارت سے کچھ دُور ہٹ کر چاروں طرف سے چار دیواری بنائی گئی جیسے قلعہ کی فصیل یا حصار ہوا کرتی ہے۔ بظاہر اس سے یہ غرض و غائت تھی کہ اس چار دیواری کے درمیان جو عمارت ہے وہ بیرونی حملوں سے محفوظ و مامون رہے۔ خاص کررات کے وقت کوئی فرد اس عمارت کے اندر اُس وقت تک داخل نہ ہوسکے جب تک شہر پناہ کے نگراں افسر سے اجازت نہ مل جائے۔ اجازت لے کر چار دیواری کے اندر آنا ہوتا پھر صحن طے کرکے حرم تک پہنچنا نصیب ہوتا تھا۔ اس طرح ہر آنے جانے والا نظروں کے سامنے رہتا تھا جیسا کہ اُس وقت بنی اُمیہ کی جابر و ظالم حکومت کی وجہ سے ضرورت تقاضہ کرتی تھی۔

تیسری فصل

حائر اور اُس کی وجہ تسمیہ

جیسا کہ قرائن سے عندیہ ملتا ہے حآئر نام پڑنے کی وجہ یہ ہے کہ بہت پہلے سے دستور چلا آرہا تھا کہ ہر وہ عمارت جو پناہ گاہ کے طور یا لوگوں کے ایک جگہ اکٹھا ہونے کے لئے بنائی جاتی تھی اس کو حائر کہا جاتا تھا۔ مورخین اور اربابِ جغرافیہ نے اس نام کے بہت سے مقامات گنائے ہیں۔ حآئر کے نام کے بھی اور حیٓر کے نام کے بھی۔ جیسا کہ علامہ طبری نے ذکر کیا ہے بخت نصر کلدانی بادشاہ نے حیرہ میں بازار کے طور پر ایک حیر تعمیر کرایا تھا، جو ان عربوں کے لئے تھا جو اُن شہروں میں سکونت کیا کرتے تھے اور جب قبر امام حسینؑ پر عمارت تعمیر ہوئی اور اُس عمارت کے چاروں اطراف چاردیواری بھی تعمیر کرائی گئی تو اُس کو بھی حائر کہا گیا۔ اسلئے کہ کوئی دوسرا نام اس سے بہتر ہی نہ سوجھا۔ وہ عمارت مسجد تو نہیں تھی کہ اُس کو مسجد کا نام دیا جاتا، نہ جامع تھی کہ جامع کے نام سے پکاری جاتی لہذا ایسا نام رکھنا لازمی تھا جو اُس وقت کی کیفیت کے عین مطابق ہو۔

یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس دور میں اس قسم کی عمارتوں کا نام حائر رکھنے کا عام طور پر دستور رہا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ نام امام حسینؑ کی قبر شریف کو دشمنوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کیلئے رکھا گیا ہو۔ دوستدارانِ اہل بیتؑ جب امام حسینؑ کی قبر شریف کا ذکر کرتے تھے تو بجائے کربلا کہنے کے حائر کہا کرتے۔ اس طرح بنی اُمیہ کو خبر نہ ہو پاتی اور زائرین اُن کی ظلم و زیادتیوں اور ایذا رسانیوں سے امان پاتے۔

گو کہ اس دور کی اصطلاح میں حائر اس چاردیواری کا نام تھا جو قبر شریف کو چارسو محاصرہ کئے ہوئے تھی۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ یہ چاردیواری قبر مطہر کیلئے

خارجی حملوں کے تعلق سے ایک بڑی رکاوٹ اور محافظ تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ یہ عمارت زائرین کی جائے پناہ تھی اور وہ اس میں آکر سر چھپاتے تھے اس لئے یہ نام پڑا ہو۔

علمائے دین کی آرأ اور ارشادات سے بھی حائر نام پڑنے کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ابن ادریسؒ نے اپنی کتاب "السّرائر" میں ضبطِ تحریر میں لایا ہے:-

"حائرؔ اُس چار دیواری کا نام ہے جو حضرت امام حسینؑ کے روضۂ مقدس اور وہاں تعمیر شدہ مسجد کو محصور کیئے ہوئے ہے"۔

دورِ حاضر میں روضۂ حسینیؑ کی پوری عمارت کو کبھی صحن الحسینؑ کہا جاتا ہے کبھی حرم الحسینؑ، کبھی جامع الحسینؑ کی نام سے پکارا جاتا ہے تو کبھی مسجد الحسینؑ کے لفظ سے، یا کبھی روضۂ حسینیہ یا حضرہ حسینیہ کی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ سب نئی تعبیرات ہیں اور جیسے جیسے دن بیتتے گئے ناموں میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ابتدائی دور میں ان ناموں کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس زمانے میں تو صرف حائر الحسینؑ یا حائر الحسینیؑ کہا جاتا تھا جیسا کہ ارباب فقہ اور مورخین کے آثار واقوال سے عیاں ہے۔ یاقوت حموی معجم البلدان میں لکھتے ہیں:

"وَالْحَائِرُ قَبْرُ الْحُسَیْنِ بْنِ علی رضی اللّٰہ عنہ" حائر قبر حسین بن علیؑ کو کہتے ہیں۔

یا جیسا کہ لسان العرب میں ہے حائر سے مراد کربلا ہے۔ اس قسم کے اور بہت سے اقوال ہیں۔

لیکن آج کی کیفیت بنی اُمیہ کے پرآشوب دور اقتدار کے بالکل منافی ہے۔ بنی اُمیہ کے دور میں تو کربلا کا نام بھی زبان پر لانا اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا مگر اس دور کے خاتمے کے بعد اس ارضِ پاک کی عظمت وجلالت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور اسی لحاظ سے اس سرزمین کی نسبت ایک سے بڑھکر ایک معزز نام بھی معرض وجود میں آتا رہا۔ اب صرف کربلا ہی کو نہیں بلکہ دیگر ائمہ طاہرینؑ کے مزارات کیلئے بھی عتبات عالیات کا نام استعمال ہونے لگا۔ یہ اس والہانہ مودت اور عقیدت واحترام کی وجہ سے ہے جو اِن ائمہ حق وہدایتؑ کے تیئں مسلمانوں کے دلوں میں متلاطم اور موجزن ہے۔

چوتھی فصل

حائر اور حیر کی تاریخی تحقیق

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے کہ ابتدائی دور میں کربلا حیر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ حیر اگرچہ حائر کا مخفف ہے اور دونوں ایک ہی سے نام ہیں لیکن گردش روزگار کے ساتھ دونوں کے استعمال میں فرق آ گیا۔ حیر پورے شہر کربلا کا نام ہو گیا اور حائر محض روضۂ حسینیؑ کے ساتھ مختص ہو گیا جیسا کہ مورخین اور اربابِ جغرافیہ کی نگارشات اور بیانات سے واشگاف ہوتا ہے، مثلاً یاقوت حموی لکھتے ہیں:۔

"حائر قبر حسینیؑ کا نام ہے اور جب کربلا کہنا ہوتا ہے تو حیر کہتے ہیں۔ بغیر کسی اضافت کے یعنی حیر بذات خود خاص شہر کربلا کا نام ہے۔(معجم البلدان)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حائر اور حیر اگرچہ ایک ہی اصل سے مشتق ہیں اور حیر، حائر کا مخفف ہے لیکن دونوں الفاظ مترادف نہیں یعنی ایک ہی چیز کے دو نام نہیں، بلکہ حیر کربلا کا نام ہے جبکہ حائر روضۂ حسینیؑ کیلئے مخصوص ہے۔

نیز کربلا کا نام اس وقت حیر پڑا جب اس کی حالت ایک شہر کی مانند ہو گئی تھی۔ مکانات، بازار، دوکانیں وغیرہ معرض وجود میں آ گئیں تھیں جیسا کہ فرانسیسی دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں لفظ حیر کی تشریح کے ضمن میں مرقوم ہے کہ بخت نصر نے اپنی مملکت میں موجودہ عربوں کیلئے کربلا میں ایک حیر بنوایا یعنی بازار کے طرز پر ایک محلہ اور اس میں تمام عربوں کو اکٹھا کر دیا

ہمارے کہنے کا یہ مطلب یہ نہیں کہ کربلا کا نام جب تک حؔیر نہیں پڑا تھا اس وقت تک یہاں زندگی اور آبادی کا فقدان تھا بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ کربلا حؔیر کے نام سے اُس وقت موسوم ہوا جب اُس نے ایک شہر کی صورت اختیار کرلی۔ کیونکہ اخبار وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مظلومؑ کی شہادت کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد کربلا قافلوں کیلئے قیام گاہ اور کاروان سرا بن گیا۔ تجارتی اور غیر تجارتی قافلے اس جگہ آکر رُکنے لگے۔ ایک اس کی دینی اہمیت کی وجہ سے دوسرا اس وجہ سے کہ یہ تجارتی اور زرعی علاقوں کے درمیان واقع ہے۔ پھر اس جگہ کی بہت شہرت بھی ہوگئی۔ دُور دراز علاقوں سے لوگ یہاں زیارت کے لئے آنے لگے۔ سانحۂ کربلا کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس جگہ کو تجارتی حیثیت سے جو فروغ ہوا اس کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے جو سبط ابن جوزی نے سدّی سے نقل کی ہے:۔

"سدّی کا بیان ہے کہ میں کربلا میں اُترا، میرے پاس بغرض تجارت اشیائے خوردونوش تھیں۔ ہم ایک شخص کے مہمان ہوئے۔ رات اُسی کے یہاں بسر کی۔ آپس میں امام حسینؑ کی شہادت کا ذکر ہوا۔ ہم نے کہا جو شخص بھی قتل حسینؑ میں شریک رہا وہ بدترین موت مرا۔ اس شخص نے کہا یہ بلکل غلط اور جھوٹ ہے۔ میں خود خون حسینؑ میں شریک رہا مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ جب رات ڈھلنے لگی تو دفعتاً چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم نے جب اس چیخ و پکار کا سبب دریافت کیا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ شخص چراغ کی لو ٹھیک کررہا تھا کہ اس کی انگلی جل گئی پھر پورے بدن میں آگ پھیل گئی اور وہ جل بھن گیا۔ سدّی کہتے ہیں کہ خدا کی قسم جب ہم نے اس شخص کو دیکھا تو وہ کوئلہ کا ڈھیر تھا۔

(اعیان الشیعہ جلد ۴: ص ۲۹۷)

اس روایت سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد کربلا میں بستیاں قائم ہوگئیں، مکانات بننے لگے، تجارتی لین دین ہونے لگا۔ باس ہمہ دوسری روایات سے عیاں ہوتا ہے کہ شہادت امام حسینؑ کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مختلف شہروں سے لوگ کثیر تعداد میں یہاں وارد ہونے لگے اور قبر مطہر ایک آباد جگہ کی صورت اختیار کر گئی۔ لوگ زیارات مقدسہ کے لئے آتے اور یہاں اپنی حاجتیں اور منتیں مانگا کرتے اور قبر حسینیؑ سے روشن معجزات ظاہر ہوتے۔

گویا کہ حضرت امام عالی مقامؑ کی شہادت کے بہت ہی تھوڑے دنوں کے بعد کربلا کی آبادی شروع ہوئی، بستیاں قائم ہونے لگیں، لیکن کب اور کس وقت یہ شہر حَیر نام سے موسوم ہوا غالباً اس جگہ لوگوں کے بسنے اور یہاں آباد ہونے کے ابتدائی دنوں ہی میں اس کا نام حیرت ہوا۔ لوگوں نے اس حصار کی بنا پر جو قبر حسینیؑ کے چاروں طرف تعمیر کی گئی تھی اُس کو حَیر کہنا شروع کیا۔ پھر اتنی پابندی سے اُس کو حیر کہا جانے لگا کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور ہی میں یہ شہر حَیر کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول روایتوں میں جو دوسری صدی ہجری کے اوائل میں مروی ہوئی ہیں حَیر نام ملتا ہے۔ اسی طرح علامہ طبری نے بھی ۱۹۳ھ کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے حَیر نام ہی لیا ہے۔ لیکن حَیر نام کو وہ شہرت یا دوام حاصل نہیں ہو سکا جس طرح کہ حائر کو حاصل ہوا۔

تیسرا باب

حائر کے عمومی حالات

پہلی فصل

ابتدائی دور میں حائر کی حالت

جیسا کہ روایات واحادیث سے واضح ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں حائر مقدس ۲۵ میٹر لمبی اور ۲۵ میٹر چوڑی ایک مربع اور چکور عمارت تھی۔ اس عمارت کے اوپر ایک سائبان اور گنبد تھا جو جزیرہ نمائے عرب کے مشرقی حصے میں پہلا اسلامی گنبد قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس عمارت کا صدر دروازہ جنوب کیا طرف کھلتا تھا اور آج بھی یہ دروازہ اسی جانب واقع ہے۔ دوسرا دروازہ مشرق کی طرف شہر اور بازار کی طرف واقع ہے۔ اسی دروازے سے حضرت عباسؑ کے روضہ کی سمت جایا جاتا ہے جو ساحل فرات پر واقع ہے۔ ہر دروازے پر خوبصورت نقش ونگاری کی گئی تھی اور خطِ کوفی میں قرآنی آیتیں مرقوم تھیں۔ غالباً ان آیتوں میں یہ آیت سرفہرست رہی ہوگی:۔

وَلَاتَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوافِی سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتاً بَلْ اَحيَاءٌ عِنْدَرَبِّهِمْ يُرْزَقُوْن ۔ (سورہ آل عمران آیت ۱۶۹)

(جولوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے اُنھیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں رزق پاتے ہیں)

علمائے متقدمین نے اپنی کتابوں میں روضۂ حسینیؑ کی جو تصویر کشی کی ہے اس سے

ہمیں ایک ہلکا سا اندازہ ہوسکتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں روضہ کی کیا صورت رہی ہوگی۔ حسین ابن بنت ابی حمزہ ثمالیؒ جو ثقاۃ و اکابرین شیعہ سے ہیں بیان کرتے ہیں:-

''میں بنی اُمیّہ کی حکومت کے آخری دور میں قبر حسینؑ کی زیارت کو نکلا۔

جب رات کا اندھیرا چھا گیا تو غاضریہ پہنچا۔ سب سو گئے تو میں نے غسل کیا پھر قبر اطہر کی جانب چل پڑا۔ جب حائر کے دروازہ پر پہنچا تو ایک خوبصورت شخص جس کے جسم سے خوشبو آرہی تھی اور بہت سفید برق کپڑوں میں ملبوس تھا باہر نکلا اور کہا واپس جاؤ تم قبر تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب نیم شب ہوئی تو میں ساحل فرات پر آکر بیٹھا، میں نے پھر غسل کیا اور قبر کی جانب روانہ ہوا۔ جب حائر کے دروازے پر پہنچا تو وہی شخص پھر باہر نکلا اور کہا ''اے شخص واپس جا تو قبر تک نہیں جا سکتا۔''

میں نے کہا فرزند رسولؐ سردار جوانان اہل جنت کی قبر تک کیوں نہیں جاؤں جب کہ میں کوفہ سے پیدل آیا ہوں۔ یہ جمعہ کی شب ہے مجھے خوف ہے کہ کہیں صبح نہ ہو جائے اور مجھے بنی امیہ کے سپاہی قتل نہ کر ڈالیں۔ اُس شخص نے کہا واپس جاؤ تم قبر تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں نے کہا کیوں؟ اُس شخص نے سبب بتایا۔ میں پلٹ کر پھر فرات کے کنارے پر پہنچا۔ طلوع فجر کے بعد میں نے غسل کیا اور اس کے بعد قبر حسینیؑ پر پہنچا اس مرتبہ مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ میں نے قبر کے پاس صبح کی نماز پڑھی اور پھر کوفہ واپس چلا آیا۔''

(کامل الزیارۃ ابن قولویہ: ص ۱۱۱ و ۱۱۲، کتاب اقبال ابن طاؤس: ص ۶۸
بحار الانوار جلد: ص ۱۰، ۳۰۔ نزہتہ اہل الحرمین: ص ۱۴ و ۱۵، اعیان الشیعہ جلد ۳۰۳)

اس روایت اور اسی قسم کی دیگر روایات سے عیاں ہوتا ہے کہ حائر مقدس دوسری صدی ہجری، کے آغاز ہی میں یا پہلی صدی ہجری ہی میں نمایاں، مشہور اور بہت آباد جگہ

تھی۔ چہار جوانب سے زائرین زیارت کو آتے۔ قبر پر عمارت بنی ہوئی تھی۔ اس عمارت میں سائبان بھی تھا، اوپر گنبد تھا، مسجد بھی تھی۔ روضۂ مبارک سے قریب ہی ایک اونچا بیری کا درخت تھا جسے ہارون رشید نے ۱۹۳ھ ہجری میں کٹوا دیا۔ اس کے ساتھ اُس نے قبر مبارک کو منہدم کر کے زمین کے برابر کیا اور اس کے تمام آثار معدوم کر لئے تھے تا کہ کوئی شخص قبرِ حسینؑ کی زیارت نہ کر پائے۔

بایں ہمہ اس روایت سے یہ بات بھی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اس زمانے میں بھی روضۂ مبارکہ کا باقاعدہ انتظام و انصرام تھا۔ اس کے لئے حاجب و دربان اور خدّام و منتظمین ہوا کرتے تھے اور کوئی شخص اُن کی اجازت کے بغیر قبر تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ یہ خدّام و دربان بہت پاک و صاف اور سفید برق کپڑوں میں ملبوس ہوا کرتے۔ زائرین پروانہ وار قرب و جوار اور دور دراز مقامات سے قبر مطہر کی زیارت کیلئے پا پیادہ چل کر آتے خاصکر شبِ جمعہ میں کافی بھیڑ رہتی۔ چونکہ بنی امیہ نے کربلا کے حدود میں فوجی چوکیاں قائم کر رکھی تھیں تا کہ زائرین قبر تک نہ پہنچ سکیں اور جو پہنچ جاتا تھا اُسے سخت سے سخت ایذائیں پہنچائی جاتیں، اسلئے زائرین عموماً غاضریہ میں آکر ٹھہرتے کیونکہ وہ کربلا کے قریب واقع ہے۔ ائمہ حق و ہدایتؑ خاصکر امام جعفر صادقؑ شیعوں کو تاکید کیا کرتے کہ زیادہ سے زیادہ مرتبہ حضرت امام حسینؑ کی زیارت سے مشرّف ہوں اور نینویٰ یا غاضریہ میں قیام کریں۔ چنانچہ ابو حمزہ ثمالیؒ امام جعفر صادقؑ سے یوں روایت کرتے ہیں:۔

"جب زیارات سے فراغت پا کر تم رخصت ہونے کا قصد کرو تو زیادہ سے زیادہ مرتبہ زیارت بجا لاؤ۔ تمہیں چاہیے کہ نینویٰ یا غاضریہ میں قیام کرو اور جب زیارت کے لئے جاؤ تو پہلے غسل کیا کرو اور اس طرح زیارت بجا لاؤ جس طرح وداع کے وقت زیارت بجا لائی جاتی ہے"۔ (کامل الزیارت ابن قولویہ)

غاضریہ یا نینویٰ میں ٹھہرنے کے بعد رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں زائرین اوجھل اوجھل بوجھل قدموں اکیلے اکیلے یا دستوں کی صورت میں حائر مقدس کے اندر زیارتِ قبر مطہر کے لئے جاتے اور سورج طلوع ہونے سے قبل ہی وہاں سے رخصت ہو جاتے، اس خوف سے کہ کہیں اُن پر بنی اُمیہ کے سپاہیوں کی نظر نہ پڑ جائے۔ اس روایت سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ اس دور میں ساحل فرات حائر مقدس سے زیادہ قریب تھا۔ حائر مقدس کی مذکورہ کیفیت امام حسینؑ کی شہادت کے چالیس برس بعد کی ہے۔

دوسری فصل

حائر مقدس اور اُس کی مذہبی اہمیت وافادیت

ہر دور میں ائمہ معصومینؑ اور اُن کے شیعہ حائر مقدس اور اُس کی زیارت کو بڑی فوقیت واہمیت دیتے رہے۔ وہ لوگوں کو زیارت کی ترغیب وترحیص دلاتے رہتے، تاکید کرتے کہ زندگی میں خواہ ایک ہی بار سہی مگر روضۂ اطہر کی زیارت ضرور بجالاؤ، کیونکہ یہ کام پروردگار عالمین کی رضا اور خوشنودی کا ضامن اور اس کی طرف سے زیادہ ثواب ملنے کا موجب ہے۔ اس ضمن میں ائمہ طاہرینؑ سے بڑی تعداد میں احادیث مروی ہیں۔ اُن میں روشن وواضح وہ روایات ہیں جو حضرت سید الساجدینؑ، امام محمد باقرؑ، امام جعفر صادقؑ اور امام علی نقیؑ سے مروی ہیں۔ مثلاً حضرت امام زین العابدینؑ ارشاد فرماتے ہیں:-

اِتَّخَذَ اللّٰہُ اَرْضَ کَرْبَلَا حَرَماً اٰمِناً مُبَارَکاً قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ اللّٰہُ اَرْضَ الْکَعْبَۃِ وَیَتَّخِذُ ھَا حَرَماً۔ (کامل الزیارت ابن قولویہ :ص ۲۶۷)

(اللہ تعالیٰ نے سرزمین کعبہ کو خلق کرنے اور اُس کو حرم بنانے سے بہت پہلے ارضِ کربلا کو معزز و مکرّم، جائے امن اور باعث برکت بنایا)

حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

خَلَقَ اللّٰهُ تعالیٰ اَرضَ کَربَلا قَبلَ اَن یَّخلُقَ الْکَعْبَةَبِاَربَعَةٍ وَ عِشْرِیْنَ اَلْفَ عَامٍ وَقَدَّ سَهَا وَ بَارَکَ عَلَیْهَا فَمَازَالَتْ قَبلَ خَلقِ الْخَلْقِ مُقَدَّسَةً مُبَارَکَةً وَلا تَزَالُ کَذَالِکَ حتیٰ یَجعَلَ اللّٰهُ اَفضَلَ اَرْضٍ فِی الْجَنَّةِ وَاَفْضَلَ مَنْزِلٍ وَ مَسْکَنٍ یُسْکِنُ اللّٰهُ فِیْهِ اَوْلِیَائَهُ فِی الْجَنَّةِ ۔ (کامل الزیارت از ابن قولویہ)

(اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو خلق کرنے سے چوبیس ہزار سال قبل سرزمین کربلا کو پیدا کیا، اُسے پاک و پاکیزہ اور بابرکت قرار دیا اور یہ سرزمین خلائق کی آفرینش سے پہلے بھی مقدس و مبارک رہی اور حشر تک رہے گی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس سرزمین کو افضل ترین زمین اور فضیلت مآب مسکن بنائے گا، جس میں جنت کے ساکنین، اولیائے خدا قیام کریں گے)

کربلا کو یہ قداست و پاکیزگی اسی بنیاد پر حاصل ہوئی کہ فرزند رسولؐ حضرت امام حسینؑ یہاں شہید اور دفن ہونے والے تھے۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے سرزمین مکہ کو حرم بنائے جانے سے کافی عرصہ پہلے کربلا کو حسینؑ کی قبر کی وجہ سے حرم اور جائے امن و برکت بنایا۔"

(کامل الزیارت : ص ۲۶۰)

بلاشبہ حضرت امام حسینؑ کی شہادت عظمیٰ اور اس ارضِ پاک میں آپ کے مدفون ہونے کی بنا پر ہی کربلا کو ایسا عظیم شرف عنایت ہوا اور یہ سرزمین تمام خطہ ہائے ارض سے بہتر و ممتاز قرار پائی جیسا کہ اور بھی بہت سی روایات سے ثابت ہوتا ہے۔

بعض روایات میں اس سرزمین کو قبۂ اسلام سے یاد کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام جعفر

صادقؑ اپنے آباء طاہرینؑ کے واسطے سے روایت فرماتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ نے ارشاد فرمایا:

''میرا فرزند اس سرزمین پر دفن ہوگا جسے کربلا کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس میں قبۂ اسلام تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان مومنین کو طوفان نوحؑ سے نجات دی تھی جو نوحؑ پر ایمان لائے تھے''۔ (کامل الزیارت : ص ۲۹)

ائمہ اطہارؑ شیعوں کو برابر کربلا کی زیارت بجالانے کی تاکید فرمایا کرتے۔ امام محمد باقرؑ غاضریہ کے فضائل بیان فرمایا کرتے۔ جس سے آپکی مراد کربلا ہی ہوا کرتی اور لوگوں کو یہ کہہ کر کہ ''غاضریہ میں ہمارے قبور کی زیارت کرو'' زیارتِ قبر حسینؑ کی تاکید فرماتے۔

(کامل الزیارت : ص ۲۶۹)

بایں ہمہ حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے شیعوں سے فرمایا کرتے:۔

''کربلا کی زیارت کیا کرتے رہو۔ اس سے کبھی بے تعلق نہ رہنا کیونکہ یہ سرزمین بہترین اولادِ انبیاء کو اپنے آغوش میں سموئے ہے۔ ہمارے جد امام حسینؑ کی شہادت کے ہزار برس پہلے ہی سے ملائکہ اس زمین کی زیارت کیا کرتے اور کوئی رات ایسی نہیں گزرتی کہ جبریلؑ و میکائیلؑ اس زمین کی زیارت کو نہ آتے ہوں۔ اے یحییٰ (اس حدیث کے راوی سے خطاب ہے) دیکھو اس سرزمین کا خیال تمہارے ذہن سے نہ نکلنے پائے۔'' (کامل الزیارت : ص ۲۶۹)

ائمہ حق وہدایتؑ کے ایسے ہی فرمودات واحادیث سے لوگوں کے دلوں میں سرزمین کربلا کی افضلیت و برتری وقداست و پاکیزگی کا احساس بڑھتا گیا اور پہلی صدی ہی سے لوگ ہجوم در ہجوم اس کی زیارت بجالانے کو آنے لگے۔ اس سلسلے میں ائمہ طاہرینؑ نے جو ارشادات فرمائے ہیں ان کی حیثیت محض ایک اعلان یا کسی پروپیگنڈہ کی نہیں تھی بلکہ یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت، ایک راسخ عقیدہ اور اسلام وایمان کامل کا معاملہ تھا۔ خود

ائمہ اطہارؑ کا عمل اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ان حضرات کے مذکورہ بالا ارشادات ذاتی خواہشات اور انسانی انانیت سے قطعی مبرّا تھے۔

چنانچہ ابو ہاشم جعفریؒ بیان کرتے ہیں کہ میں اور محمد بن حمزہؒ حضرت امام علی نقیؑ کی خدمت میں جب کہ آپ بیمار تھے مزاج پُرسی کے لئے حاضر ہوئے۔ امامؑ نے فرمایا کہ کچھ لوگوں کو میرے پیسے سے حائر حسینیؑ کی زیارت کو روانہ کرو۔ جب ہم باہر نکلے تو محمد ابن حمزہؒ نے کہا امام ہمیں حائر کی طرف بھیج رہے ہیں حالانکہ آپ خود اسی درجہ کے امام ہیں جس درجہ کے امام حسینؑ ہیں۔ میں امام کی خدمت میں واپس آیا اور محمد بن حمزہؒ کی بات آپ سے بیان کی۔ امامؑ نے فرمایا ایسا نہیں ہے۔ کچھ مقامات ایسے ہیں جن میں عبادت کا بجالانا اللہ کو زیادہ پسند ہے اور حائر حسینیؑ بھی ان ہی مقامات میں سے ہے۔

(کامل الزیارت: ص ۲۷۳، مزار البحار: ص ۱۴۱)

ایک اور روایت میں یہی مضمون مزید صراحت کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔ ابو جعفر ہاشمیؒ بیان کرتے ہیں کہ:-

"میں امام علی نقیؑ کی خدمت میں باریاب ہوا آپ علیل تھے اور تپ میں مبتلا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا۔ ابو ہاشم! ہمارے دوستوں میں سے کسی شخص کو حائر بھیجو جو وہاں جا کر میرے لئے دعا کرے۔ میں آپکے یہاں سے واپس ہوا، راستہ میں علی ابن ہلالؒ مل گئے۔ میں نے امام کی بات اُن سے بیان کی اور کہا کیا اچھا ہوتا کہ تم ہی چلے جاتے۔ علی ابن ہلالؒ نے کہا بسر و چشم لیکن میں کہتا ہوں کہ امام علی نقیؑ حائر سے افضل ہیں، کیونکہ آپ بھی اُسی درجہ کے امام ہیں جس درجہ کے امام حسینؑ اور آپ کا اپنے لئے دعا کرنا کہیں بہتر ہے کہ میں حائر میں جا کر آپ کیلئے دعا کروں۔ میں نے امامؑ علی نقیؑ سے یہ بات کہہ دی تو آپ نے فرمایا علی ابن ہلال سے کہہ دینا کہ حضرت

رسولؐ خدا خانہ کعبہ اور حجر اسود سے کہیں درجہ برتر و بہتر تھے مگر اس کے باوجود آپ خانۂ کعبہ کا طواف کیا کرتے، حجر اسود کو بوسہ دیتے۔ اللہ تعالیٰ کی کچھ زمینیں ایسی ہیں جن میں دعا کرنا اللہ کو زیادہ پسند ہے اور وہاں مانگی ہوئی دعا مستجاب ہوتی ہے حائر حسینیؑ بھی اُن ہی مقامات میں سے ہے"۔ (کامل الزیارت: ص ۲۷۴، مزار البحار: ص ۱۴۱)

ان تمام روایات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ائمہ معصومینؑ کے نزدیک حائر حسینیؑ کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔ یہ ارضِ پاک، زمین کے تمام حصوں سے افضل ہے۔ اللہ کو یہ بات محبوب ہے کہ اس سرزمین میں اللہ کی عبادت کی جائے اور اللہ سے دعا مانگی جائے اس سرزمین پر مانگی ہوئی دعا قبول ہوتی ہے۔ ائمہ اطہارؑ کا یہی دستور رہا۔

تیسری فصل

عالم اسلام میں حائر حسینیؑ کی اہمیت

حضرت امام حسینؑ کی شہادت اور کربلا میں مدفون ہونے سے بنی امیہ کے سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ انہوں نے اسلام کی شبیہ مسخ کرنے کے جو منصوبے بنا رکھے تھے وہ سب کے سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ حجاز کے بعد حائر حسینیؑ اسلامی شہنشاہیت کے قلب میں ایک نیا دینی مرکز بن کر اُبھر گیا جس کا سلسلہ ساحلِ فرات سے لیکر صحرائے عرب کے کنارہ تک اور صحرائے عرب کے کنارے سے لے کر مشرق بعید تک پھیلا ہوا تھا اور انوارِ نبوت مدینہ سے لیکر ایران و ہندوستان، قفقاز و ترکستان، چین و ماچین بلکہ دنیا کے چپے چپے کو جگمگا رہے ہیں۔ تیسری صدی ہجری کے آغاز ہی میں حائر حسینیؑ کا دائرۂ اثر کافی وسیع ہو چکا تھا جبکہ بنی امیہ کا نام و نمود مٹ کے رہ گیا۔ وہ ہمیشہ کیلئے ذلالت و

رسوائی کی دلدل میں دھنس گئے اور دنیا بھر کی لعنتیں ان کا مقدر بن گئیں۔

ہم ذیل میں قدامہ بن زائدہؒ کی وہ مشہور حدیث درج کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت امام زین العابدینؑ سے روایت کی ہے۔ یہ حدیث اس راز کی نقاب کشائی کرتی ہے کہ کیونکر حائر حسینیؑ کو اتنا فروغ نصیب ہوا اور کس بنا پر یہ سرزمین کعبہ کے ہم پلہ قرار پائی۔

''قدامہ بن زائدہؒ اپنے باپ سے روایت کرتا ہے کہ زائدہ کا بیان ہے کہ حضرت امام زین العابدینؑ نے مجھ سے فرمایا۔ زائدہ! مجھے معلوم ہے کہ تم اکثر ہمارے پدر بزرگوار ابوعبداللہ الحسینؑ کی قبر کی زیارت کے لئے جایا کرتے ہو۔ میں نے عرض کی جی ہاں۔ امام نے پوچھا تم اپنے بادشاہ کے مصاحبین سے ہو۔ تمہیں بڑی منزلت حاصل ہے اور تمہارا بادشاہ یہ برداشت ہی نہیں کرسکتا کہ کوئی ہم سے محبت رکھے۔ ہمیں دوسروں پر فوقیت دے۔ ہمارے فضائل اور ہمارے اُن حقوق کا ذکر کرے جو اُمت پر واجب ہیں۔ پھر تم ایسا کیوں کرتے ہو؟

میں نے عرض کی، صرف خدا اور رسولؐ کی رضا کے لئے۔ اس سلسلے میں مجھے نہ تو اس کی پرواہ ہے کہ کون مجھ سے خفا ہوتا ہے اور کون نہیں۔ نہ مجھے اس کا غم ہے کہ اس وجہ سے میں کس قدر شدید وسخت مصائب وآلام کا نشانہ بنوں۔

امامؑ نے فرمایا! کیا واقعی؟

میں نے عرض کیا! جی ہاں۔

امامؑ نے دوبارہ اور پھر تیسری بار پوچھا کہ کیا سچ کہہ رہے ہو؟ اور ہر مرتبہ میں نے جواب دیا کہ جی ہاں بالکل سچ عرض کررہا ہوں۔ آپ نے فرمایا مبارک ہو۔ مبارک ہو۔ مبارک ہو۔ میں تمہیں وہ بات بتاتا ہوں جو میرے سینہ میں پوشیدہ تھی۔ جب ہم پر کربلا میں غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، میرے والد بزرگوار شہید ہوئے

اور آپ کے تمام اصحاب، اولاد اور عزیز واقارب بھی مارے گئے اور آپ کے اہل حرم کو اونٹوں پر سوار کر کے کوفہ لے جایا جانے لگا تو میری نظر اپنے مقتولین پر پڑی جن کے اجساد مطہر زیر آسمان برہنہ پڑے ہوئے تھے۔ اس ہولناک منظر نے مجھ پر قیامت کا اثر کیا اور میرے غم والم کی کوئی انتہا نہ رہی، قریب تھا کہ میرا دم نکل جائے۔ میری یہ حالت میری پھوپھی زینبؑ نے دیکھ لی۔ وہ میرے قریب آئیں اور فرمایا بیٹا! میرے نانا، میرے باپ اور میرے بھائی کی واحد یادگار! یہ تمہارا کیا حال ہوا ہے؟ کیا اپنی جان دیدو گے؟ میں نے کہا پھوپھی میرا یہ حال کیوں نہ ہو جب کہ میں اپنی آنکھوں سے اپنے سیّد و آقا، اپنے پدر بزرگوار، اپنے بھائی، چچا اور گھر کے دیگر افراد کو گرم گرم ریت پر خاک و خون میں غلطاں دیکھ رہا ہوں۔ اُن کے لباس تک اُتار لئے گئے ہیں۔ نہ اُنہیں کفن دیا گیا نہ اُنھیں قبر نصیب ہوئی۔ ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ کوئی اُن کے قریب سے بھی نہیں بھٹکتا۔ جیسے کہ یہ لوگ رسول اللہؐ کے اہل بیتؑ نہیں بلکہ ترک و دیلم کے باشندے ہیں۔

حضرت زینبؑ نے کہا بیٹا گھبراؤ نہیں یہ تو خدا کا تمہارے جد، تمہارے باپ، تمہارے چچا سے عہد و پیماں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کے کچھ لوگوں سے جنہیں اس زمین کے فراعنہ تو پہنچانتے نہیں، ہاں آسمان کے رہنے والے بخوبی جانتے ہیں وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ لوگ ان پارہ پارہ اعضا اور خاک و خون میں غلطاں اجساد کو اکٹھا کر کے دفن کر دیں گے۔ تمہارے پدر بزرگوار کی قبر پر ایسا نشان بنا دیں گے جو کبھی معدوم نہیں ہوگا اور صدیاں بیت جانے کے بعد بھی باقی رہے گا اور کفر و شرک کے امام اور ضلالت و پستی کے پیرو کار اس کو مٹانے کے درپے ہوں گے بلکہ اِسے ملیا میٹ کرنے کی انتھک کوشش کریں گے مگر اس کا اثر و نفوذ اور

نمایاں ہوتا جائے گا اور اُسے روزافزوں سربلندی اور سرافرازی مقدر رہوگی۔ میں نے پھوپھی سے پوچھا وہ وعدہ کیا ہے؟

تو حضرت زینبؑ نے فرمایا مجھ سے ام ایمنؓ نے بیان کیا کہ رسول خداؐ کسی دن اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہؑ زہرا کے پاس آئے۔ جناب فاطمہؑ نے پیغمبرؐ کیلئے حریرہ تیار کیا۔ علی ابن ابی طالبؑ ایک طبق میں کھجوریں لائے۔ ام ایمنؓ کہتی ہیں کہ میں ایک بڑے پیالے میں دودھ اور مکھن لائی۔ رسولؐ اللہ، علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ نے یہ چیزیں نوش کیں۔ پھر رسول اللہؐ نے ہاتھ دھویا۔ علیؑ نے ہاتھ پر پانی ڈالا۔ ہاتھ دھو کر آپ نے چہرہ پر پھیرا، پھر مسرت بھری نظریں علیؑ و فاطمہؑ، حسنؑ و حسینؑ پر ڈالی۔ پھر کچھ دیر آسمان کی طرف تکتے رہے۔ پھر قبلہ رو ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیے، پھر سجدہ میں تشریف لے گئے اور رونے لگے۔ آپ کا گریہ بڑھتا گیا، پھر آپ سجدہ سے سر اُٹھا کر گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری تھا، آپ کے گریہ سے علیؑ و فاطمہؑ، حسنؑ و حسینؑ بے حد ملول ہوئے، میں بھی رنجیدہ خاطر ہوئی۔ جب کافی عرصہ آپکو روتے ہوگئی تو علیؑ و فاطمہؑ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! آپکے رونے کی کیا وجہ ہے۔ آپکے گریہ نے ہمارے دل پارہ پارہ کر دیے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا 'آج میں تم لوگوں کو دیکھ کر بہت شادماں ہوا تھا، میری نگاہیں تم لوگوں پر تھیں اور میں خدا کا شکر بجالا رہا تھا کہ تم لوگوں کے سبب خدا نے اپنی نعمتوں سے ہمیں سرفراز کیا کہ جبریل امینؑ نازل ہوئے اور کہا اے محمدؐ! اللہ نے آپکے دل کی بات کو سمجھا اور بھائی، بیٹی اور جگر گوشوں کی وجہ سے آپکو جو فرحت و شادمانی ہوئی اس کا اندازہ کیا۔ پروردگار نے آپ کیلئے اپنی نعمتوں کو مکمل کرتے ہوئے یہ خاص عنایت مرحمت فرمائی ہے کہ علیؑ و فاطمہؑ، حسنؑ و حسینؑ اور اُن

کی ذریت اور اُن کے پیروکاروں اور شیعوں کو جنت میں آپ ہی کی معیت میں جگہ عنایت فرمائے گا، اُن میں اور آپ میں کوئی تفریق نہ ہوگی۔ جن نعمتوں سے آپ سرفراز ہوں گے، اُن ہی نعمتوں سے وہ بھی مالا مال ہوں گے اور اُنہیں بھی وہی کچھ دیا جائے گا جو آپ کو دیا جائے گا یہاں تک کہ آپ خوش وخرم ہو جائیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ نیز یہ تمام نعمتیں اُنہیں اِن آزمائشوں اور صعوبتوں کے صلے میں عنایت ہوں گی جو وہ دنیا میں اٹھائیں گے اور ان مصائب وآلام کے بدلے جو اُنہیں ان لوگوں کی طرف سے جھیلنا پڑیں گے جو آپ کے اُمتی ہونے کے دعویدار ہوں گے۔ ان لوگوں کو نہ اللہ ہی سے کوئی واسطہ ہوگا اور نہ ہی آپ سے۔ آپ کے اہلبیتؑ کی شہادت گاہیں مختلف ہوں گی اور قبریں بھی ایک دوسرے سے دُور دُور۔ یہ اُن کے بارے میں اللہ کی مشیئت ہے، آپ کے لئے بھی اور اُن کے لئے بھی۔ لہذا خدا کی مشیئت اور تسلیم ورضا پر شکر بجا لایئے اور اُس کی قضا وقدر پر راضی رہیے۔

میں نے شکرِ خدا بجا لایا اور تمہارے متعلق اُس کی پسند پر راضی ہوا۔ پھر جبرئیلؑ نے مجھ سے کہا۔ اے محمدؐ! تمہارے بھائی (علیؑ ابن ابی طالبؑ) تمہارے بعد مصائب وآلام میں پڑیں گے۔ تمہاری اُمت انہیں بے بس کردے گی۔ تمہارے دشمن اُنہیں ایذائیں دیں گے اور اُنہیں بدترین خلق اور خبیث ترین خلائق قتل کر ڈالے گا۔ علیؑ کا قاتل ویسا ہی بدترین خلائق ہوگا جیسا ناقۂ صالحؑ کو ذبح کرنے والا تھا۔ علیؑ ایسے شہر میں قتل ہوں گے جہاں وہ مدینہ سے ہجرت کر کے جائیں گے۔ اسی شہر میں اُن کے اور اُن کی اولاد کے شیعوں کی نشو ونما ہوگی اور اُسی شہر میں ان شیعوں کو سخت ترین امتحانات وابتلا سے گذرنا پڑے گا۔ انہیں ہولناک مصائب کا سامنا ہوگا اور آپ کا یہ پارۂ جگر حسینؑ ایک مختصر سی جماعت کے ہمراہ جو

اُس کے عزیز واقارب اور آپ کی اُمت کے چند چیدہ چیدہ اصحاب پر مشتمل ہوگی فرات کے کنارے ایک سرزمین پر جسے کربلا کہا جاتا ہے شہید ہوگا اور اُسی کربلا کی وجہ سے (قیامت کے دن) آپ کے دشمنوں اور اُن کی نسل پر کرب وبلا کی کثرت ہوگی۔ وہ قیامت کا دن جس دن کے رنج والم اور حسرت ویاس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ سرزمین کربلا تمام خطّہ ہائے زمین پر پاک وپاکیزہ تر اور عزّت وحرمت کے لحاظ سے عظیم تر ہے۔ اس سرزمین پر آپ کا لختِ جگر اور اُس کے عزیز واقارب شہید ہوں گے۔ یہ سرزمین جنت کی وادیوں میں سے ہے۔ جب وہ دن آئے گا جس میں آپ کا نواسہ اپنے افرادِ خانہ کے ہمراہ شہید ہوگا اور اہلِ کفر وظلمت کی لشکر اس کو اپنے نرغے میں لیں گے، اس روز زمین میں بھونچال آئے گا، پہاڑ لرز اُٹھیں گے، دریاؤں میں طغیانی آئے گی اور اہل سماوات آپ اور آپ کی اولاد کے قتل پر غضبناک اور آپ کی ہتک حرمت اور اُس مصیبت واہانت پر جس کا آپ کی ذرّیت وعترت کو سامنا کرنا پڑے گا برہم ہوں گے۔ اس روز دنیا کی ہر شے خدا سے اجازت چاہے گی کہ آپ کے مظلوم ومقہور اہل بیتؑ کی نصرت ومدد کرے جو آپ کے بعد لوگوں پر خدا کے حجت ہوں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ آپ کی اُمت میں سے کچھ ایسے لوگوں کو مبعوث کرے گا جنہیں کفار جانتے اور پہچانتے نہ ہوں گے۔ اُنہوں نے نہ زبان سے حسینؑ کے خون بہانے میں شرکت کی ہوگی، نہ ہاتھ سے اور نہ نیت سے۔ وہ حسینؑ اور اُن کے اقارب کے اجساد کو سپردِ خاک کریں گے اور اُس سرزمین پر سیّدالشہداء حسینؑ کی قبر پر ایسا نشان قائم کریں گے جو صاحبانِ حق کے علَم اور مومنین کی فلاح و کامرانی کا سبب بن جائے گا۔ رات دن لاکھوں کی تعداد میں آسمان کے فرشتے

اس جگہ کا احاطہ کیئے رہیں گے، وہ حسینؑ کے لئے دعائے رحمت کریں گے، اُن کی قبر کا طواف کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتہلیل اور زائرین کے لئے دعائے مغفرت کریں گے اور آپ کی اُمت میں سے جو بھی خدا کی رضا اور آپ کی خوشنودی کے لئے قبر حسینؑ کی زیارت کے لئے آئے گا اُس کا نام لکھتے جائیں گے۔ کچھ لوگ جن پر اللہ کا غضب اور لعنت لازم ہو چکی ہے انتھک کوششیں کریں گے کہ اس قبر کا نام ونمود مٹا ڈالیں مگر اللہ تعالیٰ اُن کی ہر کوشش رائیگان کر کے رکھدے گا۔

پس رسول خداؐ نے فرمایا اسی بات نے مجھے رنجیدۂ خاطر اور اشکبار کیا۔

حضرت زینبؑ نے فرمایا جب ابن ملجم ملعون نے میرے پدر بزرگوار پر تلوار کا وار کیا اور میں نے موت کے آثار دیکھے تو عرض کی بابا جان! اُم ایمنؓ نے مجھ سے ایسی ایسی حدیث بیان کی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آپ کی زبان سے بھی سُن لوں۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا جان پدر! ام ایمنؓ نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا ہے جب تم اور دیگر مخدراتِ اہل حرم اس شہر میں بے بس و بے آسرا کنیزوں کی مانند لائی جائیں گی۔ دل میں اس بات کا شدید اندیشہ لاحق ہوگا کہ کہیں وہ لوگ تمہیں قتل نہ کر ڈالیں۔ جان پدر! صبر کرنا۔ قسم ہے اُس ذات کی جس نے دانہ کو شگافتہ اور روح کو پیدا کیا۔ اُس دن روئے زمین پر تمہارے اور تمہارے شیعوں اور دوستداروں کے سوا نہ خدا کا کوئی ہوگا نہ میرا۔

رسولؐ خدا نے جس وقت یہ حدیث بیان کی تھی، اُسی وقت بتا دیا تھا کہ اُس دن ابلیس مسرت وانبساط کے عالم میں اُڑا پھرے گا۔ اپنے شیطانوں سمیت تمام روئے زمین کا چکر لگائے گا اور کہے گا۔ ''گروہ شیاطین! آج ہم نے نسلِ آدم سے اپنا انتقام لے لیا اور اُن کو ہلاک کر کے اپنا منزل مقصود پالیا اور اُنھیں جہنمی

بنا دیا، صرف اُن گنے چُنے لوگوں کے بغیر جو اِن اہلبیتؑ کے دامن سے متمسک رہے، تم اب سرگرمی سے ان اہلبیتؑ کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرواور اُن کو اِن کی دشمنی وعداوت پر مجبور کرو۔ اُن کے دوستوں کے متعلق لوگوں کو بہکاؤ تا کہ خلائق کی گمراہی اور اُن کا کفر پختہ ہو جائے اور کوئی بچنے نہ پائے۔ ابلیس نے جو اگر چہ پکا جھوٹا ہے سچ ہی کہا تھا کہ تم اہلِ بیتؑ کی عداوت کے ساتھ کوئی عمل صالح فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور تمہاری محبت کی موجودگی میں سوا گناہان کبیرہ کے اور کوئی گناہ ونقصان رساں نہ ہوگا۔

زائدہؒ کہتے ہیں کہ حضرت امام زین العابدینؑ نے اس حدیث کو بیان کر کے مجھ سے فرمایا، اس حدیث کو یاد رکھنا۔ اگر اس حدیث کی تلاش وجستجو میں تم سال بھر چکر لگاتے پھرتے تب بھی کم تھا۔"

(کامل الزیارت : ص۲۶۰ تا ۲۶۶ بحارالانوار جلد:۱۰: ص۲۳۷)

اس حدیث کا پہلا حصہ یعنی حضرت امام زین العابدینؑ کا زائدہؒ سے یہ کہنا کہ تمہیں بادشاہ کے یہاں بڑی قدرومنزلت حاصل ہے اور تمہارا بادشاہ یہ برداشت ہی نہیں کرسکتا کہ کوئی ہم سے محبت کرے اور ہمیں دوسروں پر سبقت وفوقیت دے اس بات کا غماز ہے کہ زائدہؒ اموی حکومت کے خاص مصاحبین اور نمک خواروں میں سے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ مخلص شیعہ اور موثق راوی بھی تھا۔ یہ زائدہ بن قدامہ ثقفیؒ ہیں۔ شیخ طوسیؒ نے اپنے رجال میں انھیں حضرت امام محمد باقرؑ کے اصحاب میں شمار کیا ہے جبکہ اُن کے فرزند قدامہ بن زائدہؒ کے متعلق منتہی المقال میں مرقوم ہے کہ وہ حضرت صادق آل محمدؑ کے اصحاب میں سے تھے۔

❀❀❀

چوتھی فصل

دورِ اوّلین میں حائر کی حالت

اموی دور خلافت میں کربلا کے چاروں جانب فوجی چوکیاں قائم تھیں جہاں ہر وقت ہتھیاروں سے لیس فوجی دستے تعینات رہتے تھے تاکہ زائرین قبر حسینؑ تک پہنچ نہ پائیں۔ اگر کوئی شخص حکم کی عدولی کرتا تو اُسے گوناگوں سزائیں دی جاتیں۔ کبھی کبھی قتل بھی کر دیا جاتا۔ حائر کی بہت کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ کوتوالی پر مامور سپاہی آنے جانے والوں پر سختی سے نظر رکھتے۔ جس کے نتیجے میں عام راستے سے آنے جانے والے زائرین شاید و باید ہی بچ پاتے۔ زیادہ تر زائرین غاضریہ یا نینوا کی طرف سے ہو کر جاتے جہاں سے عموماً آمد و رفت نہیں ہوا کرتی تھی۔ کربلا کی ناکہ بندی کیئے ان فوجی چوکیوں کا خوف ابتدائی دور میں زائرین کیلئے حائر حسینؑ کی زیارت بجالانے میں بہت بڑی رکاوٹ بنا رہا۔

بنی اُمیہ فطری طور پر اس بات پر مجبور بھی تھے کہ زائرین کی روک تھام کریں اور اُنہیں حضرت امام حسینؑ کی قبر تک پہنچنے نہ دیں کیونکہ لوگوں کا پروانہ وار فرزند رسولؐ کی قبر کی زیارت کو آنا اموی سیاست کے بالکل منافی تھا۔ اس میں یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں اس حکومت کی بنیادیں اکھڑ نہ جائیں، جس حکومت نے کل فرزند رسولؐ سے جنگ کی تھی اور اُنہیں بیدردی سے شہید کر ڈالا تھا آج کیسے اجازت دے سکتی تھی کہ لوگ اُن ہی کی قبر پر جائیں۔ اس طرح تو دو باتوں میں سے ایک بات کا ثابت ہونا یقینی تھا یا فرزند رسولؐ حق پر تھے یا بنی اُمیہ، یہی وجہ تھی کہ بنی اُمیہ ایسی بات میں پڑنا ہی نہیں چاہتے تھے جس میں اُنکی ذلت و رسوائی کا سامان تھا اور بتدریج حکومت کے زوال کا بھی اندیشہ تھا۔ اسی لئے بنی

اُمیہ لوگوں کو زیارت سے روکتے اور جو بھی زیارت کیلئے جاتا اس کو سخت سزائیں دیتے۔
لیکن ان تمام تر اوچھے ہتھکنڈوں کے باوجود نیز اس سزا و ایذا رسانی اور قتل و ہلاکت کے ہوتے ہوئے بھی زائرین کے آنے کا لامتناہی سلسلہ تھم نہ سکا۔ زیارت کو آنے والے انفرادی طور بھی آتے اور جتھوں کی صورت میں بھی ۔ وہ رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آتے پھر سورج طلوع ہونے سے قبل ہی اپنی اپنی جگہ واپس چلے جاتے تھے جیسا کہ حسین ابن بنتِ ابی حمزہ ثمالیؒ کی اُس روایت سے اخذ ہوتا ہے جسے ہم گذشتہ صفحات میں نقل کر چکے ہیں۔ کربلائے معلیٰ میں تقریباً ستر برس یعنی ۱۳۲ھ ہجری کے کچھ پہلے تک یہی فضا قائم رہی جس برس بنی امیہ کی حکومت پوری طرح لڑکھڑا گئی۔
اِن ستر برسوں کے دوران حائرِ حسینیؑ اسی شان سے قائم رہا کہ چہار جوانب فوجی چوکیاں اس کا حصار کئے ہوئے تھیں ۔ چوکیوں میں تعینات سپاہی دُور سے اُس پر نظر جمائے رہتے اور جونہی رات اپنی زلفیں بکھیرتی تو بہت سی پرچھائیاں اُس زمین پر حرکت کرتی نظر آتیں۔ یہ زائرین کی پرچھائیاں ہوتیں، جو قرب و جوار اور دُور دراز مقامات سے دل میں زیارت کی حسرت لئے آتے۔ وہ غاضریہ، نینویٰ، کوفہ اور آس پاس کی بستیوں کی طرف سے قبرِ حسینیؑ تک اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر چھپتے چھپاتے پہنچتے۔ ہر رات، بالخصوص شبِ جمعہ کو حائرِ حسینیؑ زائرین سے چھلکنے لگتا۔ کوئی نوحہ و شیون کرتا، کوئی نمازیں پڑھتا، کوئی قبر مبارک کو بوسہ دیتا وہ اس طرح کہ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوتا۔ یہ لوگ خوشی سے جھوم اٹھتے کہ ہماری تقدیر نے ہمیں فرزندِ رسول کی قبر تک پہنچنے کی سعادت حاصل کرنے میں معاونت کی۔ صبح ہوتے ہی حائرِ حسینیؑ پھر سنسان ہو جاتا، پردے گرا دیے جاتے، دروازے بند کر دیے جاتے اور رات ڈھلنے تک وہاں نہ کوئی آتا اور نہ کوئی جاتا۔
روایات و احادیث کو ٹٹولنے سے بنی اُمیہ کے عہدِ سلطنت میں حائرِ حسینیؑ کی یہی

کیفیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ باوجودیکہ اس ستر سالہ طویل مدت میں بنی اُمیہ زائرین کو ہر قسم کی ایذائیں پہنچاتے رہے لیکن وہ فطری و طبعی تقاضوں کی روک تھام کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے اور نہ ہی لوگوں کو مذہبی اعتقادات اور اہلبیتؑ سے تمسّک کے جذبے کو ختم کرنے پر قادر ہوئے۔ جتنی سخت رکاوٹیں قائم کی جاتیں اُتنا ہی اُن کا مردانہ وار مقابلہ کیا جاتا۔ نجانے کتنی گردنیں کٹیں، کتنے سر قلم ہوئے، کتنے ہاتھ پیر جسموں سے جدا ہوئے، کتنے لوگ سولیوں پر لٹکے، کتنے گھوڑوں کے ٹاپوں سے روندھ ڈالے گئے، پھر بھی زائرین کا تار ٹوٹ نہ سکا۔ زیارت کو آنے والے آتے ہی رہے کیونکہ ان کے دلوں کی عمیق ترین گہرائیوں تک اہلبیت اطہارؑ کی عقیدت راسخ تھی اور اُن کی مودت ومحبت ان کے رگ و پے میں موجزن ومتلاطم تھی۔

وہ قوی اور محکم عوامل جن کے پیش نظر زائرین روضۂ حسینیؑ تک پہنچتے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی رکاوٹ کو پھاندڈالتے کئی ایک تھے مثلاً مودت وایمان اور اہلبیتؑ اطہار سے وابستہ دینی عقائد، ائمہ اطہارؑ کا شیعوں کو ترغیب دلانا کہ وہ حائر حسینؑ کی زیارت کو ضرور جائیں اور وہاں اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں۔ حائر حسینیؑ سے قریب ایسی پناہ گاہوں کی موجودگی جہاں زائرین بنی امیہ کے سپاہیوں سے محفوظ رہتے جیسے غاضریہ ونینوا وغیرہ۔

یہی اسباب زائرین کو زیارت کے لئے ابھارنے کے سب سے بڑے محرکات تھے۔ لہذا وہ جان کی بازی لگا کر کربلا پہنچتے، ہم اب یہاں ان مذکورہ بالا اسباب وعوامل کی اثر انگیزیوں پر مختصر سا تبصرہ اور تجزیہ پیش کر رہے ہیں۔

اوّل:- اہلبیتؑ پیغمبرؐ کے تئیں لوگوں کا بے پناہ عقیدہ اور اس عقیدہ کا دل کی گہرائیوں میں راسخ ہونا اس بات کا سب سے بڑا محرک تھا کہ حائر حسینیؑ کو مستحکم اور اُس کے شعائر کو قائم کیا جائے اور دور ونزدیک ہر طرف سے قبر حسینیؑ کی زیارت کو پہنچا جائے۔

بہت سی روایات واحادیث اس بات کے غماز ہیں کہ ابتدائی دور سے ہی لوگ جوق در جوق زیارت کی قصد سے اور اپنی حاجتیں لیکر قبر مبارک پر آتے اور وہاں نیکو کار و بدکار غرض ہر کسی کے لئے کرامات کا ظہور اور نزول ہوتا۔

علامہ حسن صدرؒ نے اپنی کتاب "نزھۃ اھل الحرمین فی عمارۃ المشھدین" کے صفحہ ۱۴ پر علی بن اسباطؒ (جو امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے تھے) سے روایت کی ہے کہ جس سال امام حسینؑ شہید ہوئے، ہزاروں لاکھوں بے اولاد عورتیں قبر مبارک پر آئیں اور ان کی جھولیاں بھر گئیں۔ چنانچہ قبر مطہر اور حائر حسینیؑ مسلمانوں کی عام زیارت گاہ، شجاعت و جوانمردی کی ایک ابدی یادگار اور احرار و مفکرین کا کعبہ بن گیا۔ قسمت کے مارے، زمانے کے ستائے ہوئے اسی قبر مبارک کا رُخ کرتے اور اس کی یاد تازہ کرتے اور اپنے لئے مشعل راہ بناتے جیسے مصعب بن زبیر، سلیمان بن صُرد خزاعی وغیرہ اور ان سے پہلے عبداللہ بن الحرا لجعفی، جنہوں نے ۶۱ھ ہجری کے کچھ دنوں بعد حکومتِ وقت سے ٹکر لی۔ نیز حضرت مختارؒ اور اُن ہی جیسے دوسرے لوگ۔

دوم:- ائمہ اطہارؑ کا اپنے شیعوں کو تحریک دلانا کہ وہ قبر حسینیؑ کی زیارت کو ضرور جائیں اور وہاں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں، یہ بھی بہت بڑا محرّک ثابت ہوا۔ چنانچہ حضرت امام زین العابدینؑ کے دور ہی سے تمام ائمہ ہدیٰؑ اپنے شیعوں اور دوستوں کو حائر حسینیؑ کی زیارت اور وہاں دعا کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ بنی امیہ کی طرف سے بھی روک تھام میں سختی برتی گئی، ائمہ اطہارؑ کی طرف سے ترغیب وتاکید بھی اُسی حساب سے ہوتی رہی۔ یہ دونوں طاقتیں، ایک حکومت کی طاقت دوسرے دین ومذہب کی طاقت برابر ٹکراتی رہیں۔ مگر اس تصادم کا نتیجہ ہمیشہ یہ نکلا کہ تمام پابندیاں، ہر قسم کی روک تھام عقیدت کے سامنے سرنگوں ہو کر ہتھیار ڈال گئیں اور شیعان اہلبیتؑ ایک بہت بڑی جاہ وجبروت والی حکومت

کے مقابلہ میں سرخرو اور سرافراز رہے۔

ائمہ حق وہدایت کی کوئی بھی نشست حضرت امام حسینؑ کے تذکرۂ فضائل و مصائب اور آپ کے دشمنوں سے اظہارِ نفرین سے خالی نہ رہتی۔ ہم قدامہ بن زائد ثقفیؒ کی وہ حدیث جو اُنہوں نے حضرت امام زین العابدینؑ سے روایت کی ہے اوپر بیان کر چکے ہیں۔ حضرت امام محمد باقرؑ کا دستور العمل بھی بعینہٖ اپنے پدر بزگوار جیسا رہا۔ آپ زیارت حضرت امام حسینؑ کی راہ میں پیش آنے والی ہر مصیبت کو آسان قرار دیتے اور فرماتے کہ جتنے ہی خوف و دہشت کے عالم میں امام مظلومؑ کی زیارت کی جائے گی اتنا ہی اجر وثواب میں اضافہ ہوگا۔ محمد ابن مسلمؒ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے امام محمد باقرؑ نے پوچھا:

''کیا تم قبر امام حسینؑ کی زیارت کو جاتے ہو؟ میں نے عرض کی جی ہاں! مگر بہت ہی سہمے سہمے۔ آپ نے فرمایا جتنا زیادہ خوف و وحشت کے ماحول میں زیارت کروگے اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔ جو شخص دہشت کے عالم میں زیارت بجالائے گا۔ خداوند عالم قیامت کے دن اُس کا ڈر دور کرے گا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت حاصل کرکے پلٹے گا اور اُس پر ملائکہ سلام کریں گے''۔ (کامل الزّیارت: ص ۱۲۷)

یہ بھی آپ بیان فرمایا کرتے کہ زائر حسینؑ کو ہر قدم پر کتنا ثواب ملتا ہے:۔

''سدید صیرفیؒ روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت امام محمد باقرؑ کی خدمت میں حاضر تھے۔ ایک نوجوان نے امامؑ عالی مقام کی قبر اطہر کا تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا زیارت حسینؑ کے لئے جانے والا جو قدم بھی اُٹھاتا ہے خداوند عالم اس کا ایک گناہ معاف فرمادیتا ہے''۔ (کامل الزّیارت : ص ۱۲۴)

حضرت امامِ جعفر صادقؑ کے ابتدائی دور میں جبکہ ہشام بن عبدالملک کی حکومت تھی روک تھام حد سے زیادہ سخت ہوگئی تھی۔ جناب زیدؑ کے خروج اور شہادت کے بعد جو

۱۲۱ ہجری میں رونما ہوئی، اموی حکام زبردست سختی برت لیتے اور جو زائر بھی فوجی چوکیوں پر تعینات سپاہیوں کے ہاتھ لگ جاتا اُس کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے جاتے۔

مسمع بن عبدالملک بصریؒ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے امام جعفر صادقؑ نے پوچھا:

"مسمع! تم عراق کے رہنے والے ہو کیا؟ کیا قبر حسینؑ کی زیارت کو بھی جاتے ہو؟ میں نے کہا نہیں۔ میں بصرہ میں مشہور و معروف ہوں۔ بصرہ میں بہت سے لوگ ایسے رہتے ہیں جو خلیفہ کے حامی اور ہمارے دشمن ہیں۔ مجھے خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں حکام تک میری شکایت نہ پہنچا دی جائے اور میرے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے جائیں۔ امامؑ نے پوچھا امام حسینؑ پر جو مظالم ڈھائے گئے وہ بھی تمہیں یاد آتے ہیں یا نہیں؟ میں نے کہا جی ہاں! امامؑ نے پوچھا تم کُڑھتے بھی ہوں گے؟ میں نے عرض کی جی ہاں۔ خدا کی قسم اور میں اتنا گریہ کرتا ہوں کہ میرے گھر والے میرے چہرے پر اس کا نمایاں اثر دیکھتے ہیں۔ میں خورد و نوش چھوڑ دیتا ہوں۔ امامؑ نے فرمایا خداوند عالم تمہارے آنسوؤں پر رحم کرے۔ تمہارا شمار اُن لوگوں میں ہے جو ہمارے غم میں غمگین، ہماری خوشی میں خوش اور ہمارے غم واندوہ میں مغموم واندوہگیں ہوتے ہیں۔ ہماری سراسیمگی سے وہ بھی سراسیمہ ہوتے ہیں اور ہمارے اطمینان سے اُنہیں بھی اطمینان ہوتا ہے۔" (کامل الزیارت: ص ۱۰۱)

یہ وحشت و سراسیمگی جو لوگوں کے انگ انگ پہ طاری اور رگ و پے میں جاگزیں ہوتی تھی لیکن حضرت امامِ جعفر صادقؑ کے ارشادات کو سُن کر بہت جلد فرحت و اطمینان میں بدل جاتی، خوف و ہراس کی جگہ عزم صمیم لے لیتا۔ مشتاقان زیارتِ حسینؑ پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں سربکف پروانہ وار حائر حسینیؑ کی طرف جاتے۔ امام جعفر صادقؑ کے ارشادات واحادیث اسلامی ممالک کے گوشہ گوشہ میں پہنچتے۔ ایک دوسرے

سے بیان کرتا۔ احباب واقارب اپنے خطوط میں ایک دوسرے کو یہ ارشادات لکھ بھیجتے۔ لوگوں کی ہمتیں بڑھ جاتیں۔ فرطِ شوق کے سبب ان کے قلوب میں حرارت پیدا ہو جاتی۔ دستوں کے دستے جزیرہ نمائے عرب اور ایران وغیرہ کے گوشے گوشے سے حائر حسینیؑ کی طرف اُمڈ پڑتے۔ راستے میں اُنہیں گونا گوں مصائب وآلام کا سامنا کرنا پڑتا اور وطن لوٹنے تک جان ہتھیلی پہ ہوتا اور خوف ودہشت اور خطرات کا ماحول ہمیشہ سر پر منڈلاتا رہتا۔

''ابن بکیر ارجانی جو جنوبی ایران کے کسی گاؤں کے ساکن تھے، بتایا کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کی کہ میرا قیام ارجان میں رہتا ہے لیکن میرا دل آپ کے پدر بزرگوار کی طرف کھینچتا رہتا ہے۔ جب زیارت کے لئے نکلتا ہوں تب بھی دل سہما سہما رہتا ہے اور جب واپس ہوتا ہوں تب بھی ہر وقت حکومت اور چغلخوروں کا، نیز حکومت کے سپاہیوں کا خوف تعاقب میں رہتا ہے۔

امامؑ نے فرمایا ابن بکیر! کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ہمارے لئے خائف وترساں دیکھے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ! جو شخص ہمارے خوف کی وجہ سے خائف ہوگا اللہ اُسے اپنے عرش کے سایہ میں پناہ دے گا۔ حضرت امام حسینؑ تحتِ عرش اس سے ہمکلام ہوں گے۔ اللہ قیامت کی ہولناکیوں سے اُسے بے خوف کردے گا۔ قیامت کے روز اس کے سوا سبھی خوفزدہ وحواس باختہ ہوں گے اور اگر وہ سراسیمہ ہوگا تو ملائکہ اُسے تسلی دیں گے اور خوشخبری دیکر اس کے قلب کو تسکین بخشیں گے۔ (کامل الزیارت: ص ۱۲۵۔۱۲۶)

اندازہ ہوتا ہے کہ آگے چل کر سزاؤں میں مزید سختی برتی گئی اور زائرین کے صرف ہاتھ پیر کاٹنے پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ حکومت سے سرتابی کرنیوالوں کو موت تک کو سزائیں دی جانے لگیں تا کہ حائر حسینیؑ کی طرف آمد ورفت قطعی طور پر مسدود ہو جائے۔ لیکن عین

ایسے ہی وقت زائرین تک امامؑ کے ایسے ارشادات پہنچتے جس سے ان کے قلوب کو تسکین ملتی اور جتنا خوف ودہشت لاحق ہوتا اُس سے کہیں زیادہ ان کے قلوب میں حرارت اور ارادوں میں استحکام پیدا ہوجاتا۔ زیارت امام عالی مقامؑ کی راہ میں ہر مصیبت وآفت ہیچ معلوم ہونے لگتی اور ظلم وجور کی آندھیوں سے ٹکر لینا ہی حق معلوم ہوتا۔

حائرِ مقدس اور زائرینِ حضرت امام حسینؑ پر ظلم وبربریت، قہر سامانی اور تشدد کا یہی سلسلہ بنی اُمیہ کے پورے دور اقتدار میں جاری رہا۔ زائرین ان کی طرف سے ہر لمحہ دھڑکے سہمے رہے۔ لیکن جتنی ہی رکاوٹیں سخت سے سخت برتی جاتیں اور حکومت کی دہشت انگیزیوں میں جتنا اضافہ ہوتا رہا اتنے ہی شد ومد سے ائمہ طاہرینؑ کے ارشادات واحادیث میں بھی زیارت امامِ مظلومؑ کی تحریک اور رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لانے کی تاکید ہوتی۔ گویا دبدبہ واقتدار اور مودت وعقیدہ باہم برسرِ پیکار تھے، حکومت وسیاست اور دین ومذہب میں صف آرائی تھی لیکن انجام کار حکومت کو عقیدہ اور دین ومذہب کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے اور وہ دبدبہ واقتدار خاک میں مل گیا۔ ۱۳۲ھ میں جو حضرت امام جعفر صادقؑ کی زندگی کا درمیانی حصہ تھا کہ بنی اُمیہ کی خلافت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست ونابود ہوگئی۔ اس حکومت کے زوال کے بعد کربلا نے اطمینان کی سانس لی۔ بنی عباس کے پہلے خلیفہ سُفّاح کی حکومت میں جس کا سلسلہ دو برس تک رہا نیز منصور کے ابتدائی زمانہ خلافت تک یہی اطمینانی فضا قائم رہی۔ مملکتِ اسلامیہ کے گوشے گوشے سے زائرین پوری آزادی اور اختیار کے ساتھ کربلا کی زیارت کو آتے رہتے۔ کیونکہ ہر دل میں یہ بات جاگزیں تھی کہ قبر حسینؑ کی زیارت میں برکت ہے، یہاں حاجتیں پوری ہوتی ہیں اور انجام بخیر ہوتا ہے۔ جیسا کہ موسیٰ بن قسم خضرمیؒ کی اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے جو اُس نے منصور دوانقی کے دور میں ایک یمنی شخص کے زیارت امام حسینؑ کے لئے کربلا آنے کے سلسلہ میں نقل کی

ہے۔موسیٰ بن قسم کا بیان یوں ہے:۔

''حضرت امام جعفر صادقؑ خلافتِ منصور کے ابتدائی دور میں مدینہ سے تشریف لائے اور نجف اشرف میں مقیم ہوئے، آپ نے فرمایا:

موسیٰ بڑی سڑک پر جاؤ اور وہاں کچھ دیر ٹھہر کر انتظار کرو۔ قادسیہ کی طرف سے ایک شخص تمہیں آتا ہوا دکھائی دے گا۔ جب وہ نزدیک پہنچ جائے تو اُس سے کہنا یہاں اولادِ رسولؐ سے ایک شخص قیام پذیر ہے اور وہ تم سے ملنے کا خواہاں ہے۔ یہ سُن کر وہ شخص تمہارے ساتھ آجائے گا۔

موسیٰ کہتا ہے کہ میں شاہراہ پر جا کر کھڑا ہوا۔ بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ میں بڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا مگر کوئی نہیں آیا اور میں تھک ہار کر واپس چلے جانے کے لئے سوچنے لگا۔ دفعتاً مجھے ایک آدمی کی جھلک سی دکھائی دی جو اونٹ پر سوار تھا۔ میں نظریں جمائے دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ شخص قریب آپہنچا۔ میں نے اُس سے کہا اے شخص! یہاں ایک بزرگ اولادِ رسولؐ سے تشریف فرما ہیں اور وہ تم سے ملنے کے متمنی ہیں اور اُنہوں نے مجھے تمہارے آنے کی خبر دی تھی۔ اُس شخص نے کہا مجھے اُن تک لے چلو۔ میں اُس شخص کو امامؑ کے خدمت میں لے کر حاضر ہوا اور اُس نے امامؑ کے خیمہ سے قریب اپنا اونٹ بٹھایا اور امام کی خدمت میں باریاب ہوا۔ میں خیمہ کے دروازہ پر اس طرح بیٹھ گیا کہ اندر کی باتیں آسانی سے سُن سکتا تھا مگر خیمہ کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ امامؑ نے اُس شخص سے پوچھا:

تم کہاں سے آئے ہو؟

وہ شخص......یمن کے دور دراز علاقہ سے۔

امامؑ......تم فلاں جگہ کے رہنے والے ہو؟

وہ شخص......جی ہاں۔

امامؑ......کس غرض سے آئے ہو؟

وہ شخص......میں حضرت امام حسینؑ کی زیارت کے قصد سے آیا ہوں۔

امامؑ......زیارت کے علاوہ اور کوئی مقصد تو نہیں۔

وہ شخص......میری اور کوئی آرزو نہیں اس کے بغیر کہ قبر مبارک کے پاس نماز پڑھوں، قبر کو دیکھوں، سلام بجالاؤں اور اپنے اہل وعیال کی طرف پلٹ جاؤں۔

امامؑ......زیارت میں تمہیں کیا فائدہ نظر آیا؟

وہ شخص......زیارت کی وجہ سے ہمارے نفوس، ہمارے اہلِ وعیال، مال واموال ہماری معاش میں برکت ہوتی ہے اور ہماری حاجتیں پوری ہوتی ہیں۔

امامؑ......زیارت کی اور خوبیاں تمہیں بتاؤں؟

وہ شخص......فرزند رسولؐ ضرور ارشاد فرمائیے۔

امامؑ......امام حسینؑ کی زیارت پیغمبر خداؐ کے ساتھ ایک حج کرنے کے مساوی ہے۔

وہ شخص تعجب ہے۔

امامؑ......ہاں خدا کی قسم بلکہ رسول اللہؐ کے ساتھ دو حج کرنے کے برابر۔ اُس شخص نے اور بھی حیرت کا اظہار کیا اور امامؑ ہر مرتبہ بڑھاتے گئے، یہاں تک کہ آپ نے فرمایا پیغمبر خداؐ کے ساتھ تیس مرتبہ حج کرنے کے مساوی ہے۔

(کامل الزّیارت: ص۱۶۲،۱۶۳)

اس دور میں زائرین اپنے اپنے وطن سے مرکبوں پر سوار ہو کر حائر حسینیؑ کی زیارت کو آیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ شرف اُن ہی لوگوں کو نصیب ہوتا جو صاحبِ ثروت ہوتے۔ غریب یا متوسط الحال اشخاص جو طول وطویل سفر کے اخراجات پر قادر نہ ہوتے،

اس شرف سے محروم رہتے۔ایسے ہی نادار و مفلس افراد کو اس شرف سے فیضیاب کرنے اور ان اجتماعات میں جو حائر حسینیؑ کے ارد گرد زائرین کا ہوتا شرکت کی ترغیب دلانے کے لئے ائمہ معصومینؑ نے اپنے ارشادات و احادیث میں اُس زائر کے لئے بے حساب اجر و ثواب کا ذکر فرمایا جو پیدل امام مظلومؑ کی زیارت کو آئے۔ حسین بن ثویر بن ابی فاختہؒ بیان کرتا ہے:۔

''حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا۔اے حسین! جو شخص زیارت حضرت امام حسینؑ کے قصد سے اپنے گھر سے نکلے اگر وہ پا پیادہ ہوگا تو اُس کے جتنے قدم اس راہ میں اُٹھیں گے ہر قدم کے عوض پروردگار عالمین اس کے نامۂ اعمال میں سے ایک نیکی لکھے گا اور اس کا ایک گناہ مٹا ڈالے گا، اور جب وہ حائر میں پہنچ جائے گا اس کا نام منتخب اور فلاح یافتہ لوگوں میں درج ہوگا اور جب آداب زیارت بجا لائے گا تو خداوند عالم اس کا نام کامران و رستگار لوگوں میں درج فرمائے گا۔'' (کامل الزیارت: ص۱۳۲)

ایک اور روایت جار مکفوفؒ نے ابو صامتؒ سے نقل کی ہے جس سے عیاں ہوتا ہے کہ پیدل زیارت کیلئے جانے والوں کا اجر و ثواب اس سے بھی بڑھکر ہے۔ابو صامتؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو ارشاد فرماتے ہوئے سُنا:۔

''جو شخص پا پیادہ قبر حسینؑ پر حاضر ہوگا پروردگار ہر قدم کے بدلے اس کے نامۂ اعمال میں ہزار نیکیاں لکھے گا اور ہزار گناہوں کو مٹا ڈالے گا اور ہزار درجہ اس کا بلند کرے گا۔جب تم فرات پہنچو تو غسل کرو، نعلین ہاتھوں میں لٹکا لو اور برہنہ پا قبر مبارک کی طرف جاؤ اور اس طرح چلو جس طرح ایک بندۂ ذلیل و خوار چلتا ہے۔ جب حائر کے دروازہ پر پہنچو تو چار تکبیریں کہو۔پھر کچھ دُور چلو پھر چار تکبیریں کہو۔پھر امامؑ مظلوم کے سرہانے آکر کھڑے ہو اور چار تکبریں کہو اور چار

رکعت نماز پڑھو اور اللہ سے اپنی حاجت طلب کرو۔ (کامل الزیارت: ص ۱۳۳)

حضرت امام جعفر صادقؑ اور دیگر ائمہ اطہارؑ کے ایسے ہی فرمودات کا اثر تھا کہ جناب صادق آل محمدؐ کے دور ہی میں کربلائے معلیٰ مسلمانوں کے مجتمع ہونے کی جگہ بن گیا۔ یہ ارشادات و احادیث ایک نے دوسرے سے بیان کئے۔ دور و نزدیک غرض ہر مقام کے لوگوں نے یہ حدیثیں سنیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخصوص ایام میں ہر سمت سے یہاں زائرین ہجوم در ہجوم پہنچنے لگے۔ اِن آنے والوں میں صاحبانِ دولت و ثروت بھی ہوتے اور مفلس و نادار مومنین بھی۔ جس شخص میں بھی آنے کی صلاحیت ہوتی وہ زیارت کیلئے ضرور پہنچتا اور دھیرے دھیرے زائرین کا یہاں آنا ایک معمول بن گیا۔ آنے والے خصوصی دنوں میں بھی آتے اور عام ایام میں بھی، کیونکہ ائمہ ہدیٰؑ کی زبان سے اس قسم کی حدیثوں نے لوگوں کے نفوس کو کربلا کی طرف متوجہ کرنے میں غیر معمولی اثر و نفوذ مرتب کیا۔ بہت سے زائرین اپنے ساتھ انواع و اقسام کے کھانے اور لذیز غذائیں بھی ساتھ لاتے جیسے سیر و تفریح کے لئے جاتے ہوں۔ اس پر ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی جانب سے سخت برہمی کا اظہار کیا جاتا۔ اس سلسلے میں ابوالمضاؒ جو رقہ کا ساکن تھا بیان کرتا ہے کہ:۔

"حضرت صادق آل محمدؐ نے مجھ سے پوچھا تم امام مظلومؑ کی قبر پر جاتے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ امامؑ نے پوچھا! کیا جاتے وقت اپنے ساتھ ناشتہ وغیرہ بھی لے جاتے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ امامؑ نے فرمایا! اگر تم اپنے ماں باپ کی قبروں پر جاتے تو ہرگز ایسا نہیں کرتے۔ میں نے عرض کیا! پھر ہم وہاں کھائیں کیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا روٹی اور دودھ۔" (کامل الزیارت: ص ۱۲۹، ۱۳۰)

ایسے ہی سخت لب و لہجہ میں آپ نے مفضل بن عمروؒ سے یوں کہا تھا:۔

"تمہارا زیارت کو جانا نہ جانے سے بہتر ہے لیکن اگر تم زیارت کو نہ جاؤ تو یہ

بھی تمہارے جانے سے بہتر ہے، مفضلؒ نے عرض کیا! مولاؑ ایسا کیوں فرمارہے ہیں؟ امامؑ نے فرمایا" تم لوگ اپنے ماں باپ کی قبروں پر تو غمگین واندوہگین، محزون ودل ملول جاتے ہو جبکہ حائر حسینیؑ کی زیارت کیلئے انواع انواع کے کھانے پینے کا سامان لے کر تمہارا جانا ہوتا ہے۔ ہر گز نہیں تمہیں پراگندہ حال اور غبار آلودہ حالت میں وہاں جانا چاہیے۔" (کامل الزّیارت: ص ۱۳۰۔۱۳۱)

حضرت امام جعفر صادقؑ کو معلوم ہوا کہ بعض لوگ جب حائر حسینیؑ کی زیارت کو جاتے ہیں تو وہاں کئی کئی دن قیام کرتے ہیں جس سے دوسرے زائرین کو پریشانی ہوتی۔ ہے امامؑ نے حکم دیا کہ حائر حسینیؑ کو اپنی قیام گاہ نہ بناؤ اور زیارت اور طلب حاجت کے بعد وہاں سے رخصت ہو جاؤ چنانچہ علی ابن حکمؒ روایت کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا:

"جب تم زیارت امام حسینؑ کا قصد کرو تو اس طرح زیارت بجالاؤ کہ تم محزون ومغموم وافسردہ واندوہگیں، پراگندہ حال، غبار آلود اور پیاسے ہو کیونکہ امامؑ مظلوم بھی اسی حال میں قتل ہوئے کہ آپ انتہائی محزون ومغموم، پراگندہ حال اور غبار آلود تھے، اسی کے ساتھ تین روز کے بھوکے پیاسے بھی۔ تم زیارت کو بجالا کر آپ کے توسل سے اپنی دعائیں مانگو۔ پھر وہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ حائر حسینیؑ کو اپنا گھر نہ بناؤ"۔ (کامل الزّیارت: ص ۱۳۱)

اسی قسم کے ارشادات اور فرمودات سے امام جعفر صادقؑ نے حائر مقدس کے دستور و آداب متعین فرمائے۔ ۱۱۴ہجری سے لے کر ۱۴۸ہجری تک جو پینتیس سال کا طویل مدت ہے آپ نے حائر مقدس کے حالات ومعاملات پر مکمل طور سے اپنی توجہ مبذول رکھی اور اُس کے آداب و دستور متعین فرمائے۔ خواہ آپ کا قیام مدینہ میں رہا ہو یا کوفہ میں یا خود حائر مقدس میں۔ اُس عرصے میں آپ نے بنی امیہ کی

دہشت گردی، ان کے دبدبۂ اقتدار اور اُن کی چیرہ دستیوں کا ہر سطح پر مردانہ وار مقابلہ کیا اور دور و نزدیک کے لوگوں کو زیارت امام مظلومؑ کی ترغیب دلائی کہ وہ تمام رکاوٹوں کو پھاندتے ہوئے امام حسینؑ کی زیارت ضرور بجالائیں، زائرین کے نفوس کو رجس و کثافت سے پاک کیا۔ حائر مقدس آنے والوں اور زائرین امام حسینؑ کے فرائض و واجبات کی طرف نشاندہی کی اور حائر حسینیؑ کو مضبوط و مستحکم، دیدہ زیب و دلکش بنانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ حالات نے جتنی بھی مساعدت کی ان کاموں کے لئے آپ نے روپے پیسے صرف کئے۔ حُجاب وخدّام، فقراء و مساکین اور مسافروں کی خدمت گذاری کی، چنانچہ اس دور میں حائر مقدس کی توسیع و مرمت کے سلسلے جتنے بھی کام انجام دیئے گئے وہ سب آپ کے حکم اور ایماء پر ہوئے۔

سوم:- مذکورہ دو اہم وجوہات کے علاوہ تیسرا سبب نینویٰ اور غاضریہ کا کربلا سے قریب تر ہونا ہے۔ ان دو علاقوں کے حائر کے نزدیک ہونے کی وجہ سے زیارت قبر امام حسینؑ میں غیر معمولی سہولیت میسر ہوئی اور زائرین کی آمد و رفت آسانی سے ممکن ہوسکی۔ غاضریہ بالکل راستہ پر واقع تھا۔ زائرین عام طور پر اسی کو اپنی منزلِ مقصود بنا کر آتے اور یہاں قیام کرنے پر کسی کو اعتراض کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ زائرین آکر غاضریہ میں قیام کرتے، پھر چھپتے چھپاتے وہاں سے حائر مقدس پہنچ جاتے غالباً بنوامیہ کے پورے دورِ اقتدار میں زائرین امام حسینؑ نے یہی دستور اختیار کیا اور اس طرح وہ جاسوسوں اور فوجی چوکیوں پر متعین سپاہیوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔ اسی طریقے پر برابر عمل ہوتا رہا اور ائمہ اطہارؑ نے بھی اس طریقے کو پسند کیا بلکہ اسی کی تاکید کی چنانچہ ابوحمزہ ثمالیؒ جو امام جعفر صادقؑ کے معتمد صحابی ہیں بیان کرتے ہیں کہ حضرت صادق آل محمدؐ نے فرمایا:

"جب زیارات سے فراغت پا کر تم رخصت ہونا چاہو تو زیادہ سے زیادہ رخصت لو اور نینویٰ یا غاضریہ تمہارا قیام کرنا چاہیے۔ پس جب زیارت کا ارادہ کرو

تو پہلے غسل کرو، پھر اس طرح زیارت بجالاؤ جس طرح جدائی کے وقت زیارت کی جاتی ہے اور جب تم زیارت سے فارغ ہو جاؤ تو اپنا چہرہ حضرت امام حسینؑ کے چہرہ کی طرف کرو اور کہو............ (کامل الزیارت: ص۲۵۴)

بظاہر اسی سبب سے غاضریہ کے فضائل میں کثرت سے احادیث وارد ہوئی ہیں چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا اشاد ہے:-

''غاضریہ بیت المقدس کی خاک ہے۔'' (کامل الزیارت: ص۲۶۹)

بہت ساری احادیث میں کربلا کو غاضریہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام محمد باقرؑ اپنے شیعوں اور دوستداروں کو زیارت امام حسینؑ اور غاضریہ میں قیام کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

''غاضریہ میں ہماری قبور کی زیارت بجالاؤ۔ (کامل الزیارت: ص۲۶۹)

ابتدائی دور میں غاضریہ ایک وسیع اور گنجان علاقہ تھا جس کا سلسلہ کربلا کے شمال مشرق تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی کے راستے میں حضرت عباسؑ کا روضہ ہے۔ جہاں آپ ساحل فرات پر مدفون ہیں جو کہ آپ کی جائے شہادت ہے۔ اس بنیاد پر بظاہر غاضریہ کی جگہ وہ ہے جہاں آج کل باغات ہیں۔ نہر حسینیہ کے دائیں جانب شہر کربلا کے شمال مشرق کی طرف ''تل میابی اور مقام امام جعفر صادقؑ[1] اور چار نہر'' کے بیچوں بیچ یہ جگہ آج بھی غاضریات کے نام سے موسوم ہے۔

اسی طرح نینویٰ بھی ایک آباد گاؤں تھا جو کربلا کے جنوب مشرق میں واقع تھا۔ غاضریہ کی بہ نسبت تاریخ میں اس کا نام زیادہ آیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر زائرین اسی علاقے میں آکر قیام کرتے تھے اور بنی امیہ کے تاریک و دہشت انگیز

1: امام جعفر صادقؑ نے زیارت امام حسینؑ بجالانے سے قبل فرات میں جس جگہ غسل فرمایا تھا وہ جگہ ایک تاریخی یادگار کی حیثیت رکھتی ہے اور آج بھی وہ جگہ ''مقام امام جعفر صادقؑ'' کے نام سے موسوم ہے۔ (ساجد)

دور اقتدار میں اسی غاضریہ اور نینویٰ سے ہو کر حائر مقدس میں پہنچتے اور زیارت بجا لا کر پھر ان ہی دو علاقوں میں واپس لوٹتے۔ یہی تین وہ اہم اسباب ہیں جن کی بدولت ابتدائی دور شیعوں اور محبان اہلبیتؑ کی حوصلہ افزائی ممکن ہو سکی۔ نہ صرف یہ کہ وہ برابر زیارت حضرت امام حسینؑ کیلئے حائر مقدس پہنچا کرتے رہے بلکہ اُنہوں نے اس کی عمارت کو مضبوطی اور استحکام بخشا اور اسکے شعائر قائم کیے۔

اگر بنی اُمیہ اور بنی عباس دونوں خاندانوں کے عہد حکومت کا تقابل کیا جائے باوجودیکہ بنی اُمیہ نے زائرینِ حضرت امام حسینؑ کے لئے ہر قسم کی رکاوٹ کھڑی کی، اُن پر ظلم واستبداد کے پہاڑ توڑے، اُن پر نت نئے عتاب وعقاب ڈھا دیئے لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ امام عالیمقامؑ کی شہادت کے بعد ستر برس کا عرصہ یعنی بنی امیہ کے اقتدار کے انحطاط تک کا ہی عرصہ کربلا اور قبر امام حسینؑ کے لئے سب سے بہتر دور تھا۔ اگرچہ بنی اُمیہ نے امام حسینؑ کو کربلا میں تین روز کا بھوکا پیاسا شہید کیا لیکن اُنہوں نے اتنے ہی پر اکتفا کی۔ قبر مُطہر سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی، اُسے اپنے قہر واستبداد کا نشانہ نہیں بنایا۔ رہ گئیں وہ فوجی چوکیاں جو کربلا کے آس پاس متعین کی گئیں، قبر مطہر کے زائرین کی وہ روک تھام اور یہ کوشش کہ قبر مطہر تک کوئی پہنچنے نہ پائے وہ صرف اپنی حکومت کی حفاظت کی غرض سے تھی۔ حکام کو حائر مقدس میں زائرین کے اجتماع اور امام حسینؑ کی المناک شہادت کی وسیع تشہیر سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں بغاوت نہ پھوٹ پڑے اور اہل بیت طاہرینؑ کے شیدائی کہیں حکومت کا تختہ نہ اُلٹ دیں جیسا کہ عبیداللہ بن الحرالجعفی اور سلمان بن صرد خزاعی وغیرہ کے واقعات کے دوران ہوا تھا۔ لیکن جہاں تک بنی عباسی حکمرانوں کا تعلق ہے اُن کو تو جیسے اس بات کا ملال تھا کہ وہ بھی حسینؑ کا خون بہانے میں کیوں نہ شریک ہوئے، اُنہوں نے دل کی ساری بھڑاس اُن کی قبر اطہر پر نکالی اور بار بار اس بات کی کوشش کی کہ

قبر اطہر کا نام و نمود ہی مٹ جائے، حائرِ مقدس ویران اور شہر کربلا ایک بیابان کی صورت میں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے ہر طبقہ نے جی کھول کر اُنہیں بُرا بھلا کہا۔ شعرائنے ان کی مذمت اور ہجو میں بے شمار اشعار کہہ ڈالے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

تا للّٰہِ اِنْ کانَتْ بَنِیْ اُمَیَّۃَ قَدْ اَتَتْ قَتَلَ اِبْنِ بِنْتِ نَبِیِّھَا مَظْلُوماً

خدا کی قسم اگر بنی اُمیہ نے پیغمبرؐ کے نواسے کو مظلوم قتل کیا۔

فَلَقَدْ اَتَاہُ بَنُوْ اَبِیْہِ بِمِثْلِہٖ ھٰذَا لَعُمْرُکَ قَبْرُہٗ مَھْدُوماً

تو اس کے خاندانی رشتہ داروں (بنی عباس نے جو پیغمبرؐ ہی کے خاندان سے ہیں) نے بھی ایسی ہی حرکت کی کہ یہ حسینؑ کی قبر منہدم پڑی ہوئی ہے۔

اَسِفُوْا عَلیٰ اَنْ لَّایَکُوْنُوْا شَارَکُوْا فِیْ قَتْلِہٖ فَتَتَبَّعُوْہُ رَمِیْماً

اُنہیں بڑا دُکھ ہے کہ وہ بھی حسینؑ کے قتل میں شریک کیوں نہ رہے۔ اس کی کسر اُنہوں نے حسینؑ کی بوسیدہ ہڈیوں کو اپنی قہر سامانیوں کا شکار بنا کر پوری کی۔

بنی امیہ کا حائر مقدّس سے تعرّض نہ کرنا اور بنی عباس کا بار بار قبر مطہر کو اپنے ظلم و بربریت کا نشانہ بنانا غالباً اس کا اصل سبب دار الخلافہ کا محل وقوع بھی ہے۔ یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ دونوں حکومتوں کا دار الخلافہ حائر مقدس سے جتنا نزدیک ہوا اتنا ہی زیادہ اس کا بس چلا اور جتنا دور ہوا اتنا ہی کم۔ شام چونکہ حائر مقدس اور کربلا معلیٰ سے کافی دور ہے لہذا اموی خلفاء کو کربلا میں کیا ہو رہا ہے اُس پر توجہ کرنے کا کم موقع ملا۔ اس کے برعکس بنی عباس کا دار الخلافہ بغداد تھا جو کربلا کے بلکل قریب واقع ہے لہذا ان کے دور میں یہ شہر ظلم و تعدّی اور انہدام و تاراجی کا زیادہ نشانہ بنا۔ اموی سلاطین دمشق میں بیٹھ کر حائر حسینیؑ کے خلاف جتنے منصوبے بناتے اُن کی اس طرح حرف بہ حرف تعمیل نہ ہو پاتی جس طرح کہ بنی عباس کے منصوبے اسی قربت کی وجہ سے مکمل طور عملی جامہ پہن لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اموی دور اقتدار میں حائر مقدس پر اتنی تباہیاں اور قہر سامانیاں پیش نہیں آئیں جتنی عباسی عہدِ حکومت میں آئیں۔

پانچویں فصل

حائرِ مقدس کی بابرکت زمین اور اُس کی مقدس خاک

(۱) کربلا کی عظمت اور اسلام میں اُس کی خاک کا تقدس

اسلام میں کسی سرزمین کو بھی وہ شرف و عظمت نہیں حاصل ہو سکی جو ارضِ کربلا کو حاصل ہے جیسا کہ صریحی احادیث اس کا بیّن ثبوت ہیں۔ سرزمینِ کربلا خدا کی وہ منتخب سرزمین ہے جو مقدس، پاکیزہ و بابرکت، اور ان زمینوں میں شامل ہے جنہیں خدا و رسولؐ کا "حرم" قرار دیا گیا ہے۔ یہ وہ "قبۂ اسلام" ہے جس پر خدا نے ان مومنین کو جو حضرت نوحؑ پر ایمان لائے تھے طوفان سے نجات دلا دی۔ یہ ان مقامات میں سے ہے جہاں اللہ کی عبادت بجالانا اور اُس سے دُعائیں مانگنا اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی وہ سرزمین ہے جسکی خاک میں شفا ہے۔ (کامل الزیارت: ص ۲۶۷)

حضرت امام حسینؑ کی شہادت سے لیکر آج تک شعرأ، علمأ و مصنفین ارضِ کربلا کو سرزمین کعبہ کے ہم پلہ قرار دیتے آئے ہیں۔ کربلا کے فضائل و مناقب، اس کا تقدس اور اس کا رتبہ نثر و نظم دونوں میں مختلف انداز و اسلوب سے بیان ہوتا رہا۔ ظاہر ہے کہ اسلام میں اس سرزمین کو یہ شرف، و عظمت صرف حضرت امام حسینؑ کی شہادت اور ان کے مقدس لہو کی بدولت حاصل ہوئی۔ روایات و احادیث سے اس کی باقاعدہ صراحت ہوتی ہے۔

خاک کربلا کی عظمت و تقدس نہ صرف ائمہ اطہارؑ ہی کی اقوال و ارشادات سے ثابت ہوتی ہے بلکہ آنحضرتؐ سے مروی متعدد احادیث قدسی میں بھی اس تقدس مآب سرزمین کا ذکر ہے جو شیعوں کے طریق سے بھی مروی ہیں اور اہلسنت کے طریق سے

بھی۔ مسلمانوں کے ہر مسلک وفرقہ کے علماء نے اپنی اپنی کتابوں میں سرزمین کربلا کے غیر معمولی فضائل کی حامل احادیث درج کی ہیں۔ ابوریحان البیرونی نے اپنی کتاب ''آثار الباقیہ'' میں خاک کربلا کو انتہائی مسعود و بابرکت قرار دیا ہے۔ علامہ سیوطی نے اپنی کتاب ''خصائص''، مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۲۰ھ میں شہادت امام حسینؑ کے متعلق پیغمبرؐ کی پیشنگوئیوں پر مشتمل ایک مستقل باب ''باب اخبار النبیؐ بقتل الحسینؑ'' شامل کیا ہے۔ جس میں اُنہوں نے امام بیہقی، ابونعیم اور اُنہی جیسے دیگر اکابر علماء اہلسنت کے حوالے سے تقریباً بیس حدیثیں مشاہیر اصحاب و ازواج نبیؐ کی نقل کی ہیں۔ جیسے ام الفضلؓ بنت الحارث (حضرت عباسؓ عمِ پیغمبرؐ کی بیوی)، جناب اُم سلمہؓ، حضرت عائشہؓ (ازواج پیغمبرؐ)، انسؓ بن مالک وغیرہ۔ بیشتر احادیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اُم سلمہؓ اور انسؓ بن مالک سے منقول ہیں۔ اکثر احادیث کا مضمون یہ ہے کہ ہم پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے دیکھا کہ حسینؑ آپ کی آغوش میں ہیں، رسولؐ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں جاری ہیں اور آپ کے ہاتھ میں سرخ رنگ کی مٹی ہے۔ اسکے متعلق دریافت کرنے پر پیغمبرؐ نے فرمایا:-

''جبریل امینؑ میرے پاس تشریف لائے تھے، اُنہوں نے بتایا کہ عنقریب میری اُمت میرے اس فرزند کو قتل کر ڈالے گی۔ جبریلؑ اس سرزمین (کربلا) کی سُرخ مٹی بھی میرے پاس لائے اور یہی وہ خاک ہے''۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت رسولؐ نے ارشاد فرمایا:-

''میرا یہ فرزند سرزمین عراق پر قتل کیا جائے گا اور یہ وہیں کی مٹی ہے۔ آنحضورؐ نے وہ خاک جناب اُمّ سلمہؓ کے حوالے کی اور فرمایا کہ جب تم دیکھنا کہ یہ مٹی خون بن گئی تو سمجھ لینا کہ میرا فرزند قتل کر ڈالا گیا۔ حضرت ام سلمہؓ برابر اس خاک کی نگہداشت کرتی رہی یہاں تک کہ ۶۱ھ کا عاشورہ محرم آیا۔ اُس دن جناب اُمّ سلمہؓ نے دیکھا کہ وہ خاک خون بن گئی ہے''۔

(مشکوٰۃ جلد ۸: ۱۳۹، مسند امام احمد بن حنبل جلد ۱: ۸۵، مستدرک امام حاکم: جلد ۴: ۳۹۸)

ان احادیث و روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کربلا کی عظمت اور اُس کی خاک کے تقدّس پر ہر مسلک اور ہر مکتبہ فکر کے مسلمان متفق ہیں۔ البتہ بعض دشمنانِ تشیع نے سیاسی اغراض کے تحت اس سلسلے میں شیعوں پر نت نئی تہمتیں تراشی ہیں اور ان تہمتوں کی اتنی وسیع تشہیر کی جاتی ہے کہ بہت سارے سیدھے سادھے لوگ غلط فہمی کے شکار ہو گئے، حتیٰ کہ بعض مستشرقین یورپ بھی جنہیں مسلمانوں کے مذہبی اختلاف اور ان کے رسوم و عادات سے قطعی واقفیت نہ تھی۔ "انسائیکلو پیڈیا آف برٹینکا" کی تدوین کے وقت شک و شبہ میں پڑ کر مجبور ہوئے کہ عراق کے اکابر علمائے شیعہ سے اس سلسلے میں استفسار کریں۔

(دیکھئے کتاب الارض والتربتہ الحسینیہ)

جیسا کہ ذکر ہوا کہ شک و شبہ کی وجہ دشمنانِ تشیع کا یہی پروپیگنڈا تھا کہ وہ خاک جس پر شیعہ نماز میں سجدہ کرتے ہیں بدعت ہے۔ یہ دین میں نرالی چیز ہے۔ جب یہ پروپیگنڈا مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ پھیلتا گیا اور مسلمانوں کی اکثریت تذبذب و انتشار میں مبتلا ہو گئی، ہر شخص یہ سمجھنے لگا کہ واقعی یہ سجدہ گاہ بدعت ہے۔ بعد از ان دشمنانِ تشیع نے دوسرا راگ الاپنا شروع کیا کہ یہ بُت پرستی ہے اور خاک قبر حسینؑ پر سجدہ کرنا ایک طرح اصنام اور بتوں کی پرستش کرنا ہے۔ ان دشمنانِ تشیع کو اس کی بھی تمیز نہ ہوئی کہ کسی چیز پر سجدہ کرنا اور چیز ہے اور کسی چیز کیلئے سجدہ کرنا اور بات ہے۔ اُنہوں نے سجدہ گاہ کے نت نئے نام تراشے جیسے قرص، لوح، حجر، حکر وغیرہ۔

اب ہم یہاں اظہار حقیقت کے طور پر نیز عامتہ المسلمین اور فریب خوردہ مستشرقین یورپ پر حقیقت حال واضح کرنے کیلئے سجدہ گاہ کے موضوع پر تاریخی اور مذہبی دونوں نکتہ نگاہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ اس مسئلہ کو خاک قبر امام حسینؑ اور اُس کے تقدّس سے گہرا تعلق ہے۔ لہذا ہم اس کو ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں خاک کربلا کی کس قدر پاکیزگی اور قداست ہے۔

کس چیز پر سجدہ جائز ہے اور کس چیز پر نہیں، اس بارے میں شیعہ اور دیگر فرقوں کے اختلافات

کربلا کی خاک کو سجدہ گاہ کیوں بنایا گیا ہے۔ اس کی فضیلت میں کون سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں ائمہ اطہارؑ کا کیا کردار رہا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے خاکِ قبر حسینؑ پر سجدہ کرنے کا کیا راز ہے؟ کسی چیز پر سجدہ کرنے اور کسی چیز کے لئے سجدہ کرنے میں کیا فرق ہے؟ افترا پردازوں کے اُن اعتراضات کا مدلّل جواب جو وہ خاکِ قبرِ حسینؑ پر سجدہ کرنے کے سلسلے میں کیا کرتے ہیں۔

خاکِ قبر کا احترام اور اسلام میں اس سے برکت حاصل کرنے کا دستور

ابتدائے اسلام سے مسلمان خاکِ قبر کا احترام کرتے آئے ہیں۔ آنحضورؐ کے دور ہی میں اس روایت کی بنیاد پڑ چکی تھی، جیسا کہ خود علمائے اہلسنت کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے۔ شہدائے اسلام کی خاکِ قبر، رسولؐ کی خاکِ قبر، حتیٰ کہ بعض صحابہؓ کی خاکِ قبر کا بھی احترام کرنا اور اس سے شفا طلب کرنا ابتدائی دور کے مسلمانوں کا عام شیوہ تھا۔ صدرِ اول کے اسلامی معاشرہ میں اس کا رواج ۳۰ھ ہی کے بعد سے شروع ہوا تھا۔ ۳ھ میں جب جنگ اُحد میں عم رسولؐ حضرت حمزہؓ شہید ہوئے تو آپ کی قبر کی مٹی ہر طرح کی بیماری خاصکر سر درد کے لئے شفاء سمجھی جاتی تھی۔ بایں ہمہ مسجد نبوی کی خاک بھی بطور تبرک اور بطور دوا استعمال کی جاتی تھی۔ اس تعلق سے علامہ سیّد برزنجی اپنی کتاب ''نزہتہ الناظرین فی تاریخ مسجد سیّد الاولین والآخرین''، مطبوعہ مصر کے صفحہ ۱۱۶ پر لکھتے ہیں:

''جو شخص شہر نبوی کی کوئی چیز مدینہ سے باہر لے جائے، اُس پر واجب ہے کہ مدینہ ہی میں واپس پلٹا دے، واپس پلٹانے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص ایسا نہ کرے گا تو گناہگار متصور ہوگا۔ البتہ علماء نے ان چیزوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جس کی سفر میں احتیاج رہتی ہے جیسے حرم نبوی کی خاک سے بنا ہوا برتن یا وہ خاک جو بطور دوا استعمال کی جائے جیسے جناب حمزہؓ کی جائے شہادت کی خاک جسے لوگ سر کے درد میں استعمال کرتے ہیں یا صہیب رومیؓ کی خاک قبر۔ ان چیزوں کے باہر لے جانے کی متقدمین و متاخرین سبھی علماء نے اجازت دے رکھی ہے''۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد آپ کی خاک قبر بھی بطور تبرک اور دوا استعمال کی جانے لگی۔ اس بارے میں سید نور الدین شافعی سمہودی اپنے کتاب ''وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰؐ'' میں رقمطراز ہیں:

''مطلبؓ سے روایت ہے کہ مسلمان پیغمبرؐ کی خاک قبر لے جایا کرتے۔ حضرت عائشہؓ نے وہاں دیوار کھنچوا دی۔ اس دیوار میں ایک سوراخ تھا، لوگ اس سوراخ سے خاک لے جانے لگے، حضرت عائشہؓ نے وہ سوراخ بھی بند کرا دیا۔

(وفا الوفاء جلد: ۱ صفحہ: ۳۸۵، مطبوعہ مصر)

علامہ سمہودی نے یہ تحریر نہیں کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ایسا کیوں کیا؟ غالباً اس سبب کیا ہوگا کہ اس مکان پر حضرت عائشہؓ قابض تھیں۔ اُس دور کے مسلمان انبیاء و شہداءؑ کی قبروں سے تجاوز کر کے بعض صحابہ کی خاک قبر بھی بطور تبرک استعمال کرنے لگے جیسے صہیب رومیؓ کی خاک قبر، جس کی علامہ بزرنجی نے ''نزہتہ الناظرین'' میں صراحت کی ہے لیکن یہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ صہیبؓ رومی ہی کو یہ فوقیت کیوں حاصل تھی اور دیگر صحابہؓ کرام اس امتیاز سے کیوں کر محروم رہے۔

بعد کے ادوار میں اس رواج میں اضافہ

یہ بات اسی حد تک محدود نہ رہی بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا چلا گیا یہ روایت اور رواج بھی پنپتا گیا اور مسلمانوں نے اب صرف خاک قبر کے احترام پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ معزز شخصیتوں کی خاک قدم کو بھی اُنہوں نے سرمۂ چشم بنا ڈالا۔ اس حوالے سے شیخ عبدالقادر فاکہی ''حسن التوسّل فی زیارۃ افضل الرسل'' میں خامہ فرسا ہیں:

''شیخ امام سبکی نے دارالحدیث کے فرش پر اپنے رخسار ملے جس پر امام نواوی (شارح صحیح مسلم) کے قدم پڑا کرتے تھے۔ غرض یہ تھی کہ اُن کے نقش پا کی برکت اُنہیں نصیب ہو اور اُن کی عظمت و فضیلت سے وہ بھی فیضیاب ہو۔ چنانچہ وہ اپنے اشعار میں کہتے ہیں:

وَفِیْ دَارِالْحَدِیْثِ لَطِیْفُ مَنْعِیْ عَلٰی بَسْطِهَا اَصْبُوْوَاوِیْ

لَعَلِّیْ اَنْ اَنَالَ بِحَرِّوَجْهِیْ مَكَانًا مَسَّهٗ قَدَمُ النَّوَاوِیْ

دارالحدیث کے فرش پر میں آشفتہ سر اور وارفتہ حالت میں اور اس کا چکر لگاتا رہتا ہوں۔ بہت ممکن ہے میرے رخسار اس جگہ کو پالیں جہاں نواوی کے قدم پڑ چکے ہیں۔''

اگلے ادوار میں یہ دستور مزید جڑ پکڑتا گیا، پھر کیا تھا کہ انسانوں ہی کی خاک پا کی عزت و تکریم پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ گھوڑوں خچروں کی خاک قدم بھی تبرک سمجھی جانے لگی۔ جیسا کہ علامہ ابن خلکان جلال الدولہ بن الپ ارسلان سلجوقی کے حالات میں لکھتے ہیں:

''شیخ ابواسحاق (کتاب المہذب والتنبیہ کے مصنف) چار ماہ سے بھی کم وقت میں بغداد لوٹ گئے۔ وہاں اُنہوں نے امام الحرمین سے مناظرہ کیا تھا۔ جب وہ نیشاپور سے پلٹنے لگے تو امام الحرمین اُنہیں رخصت کرنے کیلئے باہر نکلے اور رکاب تھام کر اُنہیں سوار کیا۔ اس واقعہ کے بعد خراسان میں ان کا رتبہ و مرتبہ بہت بڑھ گیا کہ لوگ اُن کے

خچر کے قدموں کے نیچے کی خاک برکت حاصل کرنے کی نیت سے اُٹھانے لگے۔"

(وفیات الاعیان: ابن خلکان: جلد۲: ص ۱۲۳)

ان سبھی باتوں سے اخذ ہوتا ہے کہ خاک کی عزت وتوقیر، اس سے شفا چاہنا، اس کو مقدس سمجھنا، خواہ وہ شہداء کی خاکِ قبر ہو یا پیغمبرؐ کی خاکِ قبر یا حرم کی خاک ہو حد تو یہ ہے کہ صہیب رومیؓ کی خاک قبر بھی بہت مشہور ومعروف بات تھی، یہ سلسلہ ابتدائے اسلام ہی سے چلا آرہا تھا اور مسلمان اس کے عادی تھے۔ پھر بزرگانِ دین وعلمائے اسلام کی خاک قدم کا احترام کہ جہاں اُن کے پیر پڑے تھے، وہاں اپنے رخسار رکھنا سعادت سمجھنا اور خیر و عافیت حاصل کرنے کیلئے وہاں اپنی پیشانیاں رگڑنا بلکہ خچر کے قدموں کی خاک بھی تبرک قرار دینا اس دور میں جو اسلام کا دورِ وسطیٰ تھا عام طور پر مروّج تھا۔ لہذا اگر شیعہ حسینؑ مظلوم کی خاک قبر کا احترام کرتے ہیں تو یہ کون سی اچھنبے کی بات ہے جبکہ حسینؑ کی خاکِ قبر ہر خاک سے بڑھ کر طیب و طاہر اور پاک و پاکیزہ ہے۔ اسکے فضائل میں پیغمبر خداؐ کے احادیث بھی وارد ہوئی ہیں۔ پیغمبر خداؐ اور جناب حمزہؓ کی خاک قبر کے متعلق اہلِ سنت کی کتابوں میں ان گنت حدیثیں ملتی ہیں۔ صہیب رومی وغیرہ کے متعلق تو کوئی حدیث بھی نہیں۔

شیعہ اور دیگر مسلمانوں کے درمیان سجدہ کے بارے میں اختلاف ہونے کی وجہ، کس چیز پر سجدہ جائز ہے کس چیز پر نہیں

سجدہ کے تعلق سے حضرت رسول خداؐ کی مشہور ومعروف حدیث جو کہ مسلمانوں کے ہر مسلک اور فرقہ میں مسلم الثبوت ہے اور سبھی فرقے اس پر متفق علیہ ہیں وہ یوں ہے:

جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طَهُوْرًا

یعنی "میرے لئے پوری زمین سجدہ گاہ اور پاک وپاکیزہ قرار دی گئی"۔

شیعہ ہوں یا دیگر تمام اسلامی مسالک سبھی مکتبۂ فکر تو اسی حدیث پر عمل پیرا ہیں۔
سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اختلاف کی وجہ کیا؟ جس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کے دیگر فرقے ہر چیز پر سجدہ کرنا جائز مانتے ہیں جبکہ شیعہ صرف زمین اور اُن چیزوں پر سجدہ جائز جانتے ہیں جو زمین سے اُگی ہوں اور وہ کھانے یا پہننے کی نہ ہوں، نہ ہی معدنیات ہوں۔
اس اختلاف کا سبب بظاہر فقہی اختلاف ہے۔ شیعوں نے آنحضرتؐ کی مذکورہ بالا حدیث کے معنی کچھ اور سمجھے اور دیگر مسلمانوں نے کچھ اور۔ پہلا اختلاف تو یہ ہے کہ زمین کے معنی کیا ہیں اور اس کا اطلاق کن کن چیزوں پر ہوتا ہے۔ دوسرا اختلاف یہ کہ پیغمبر خداؐ نے جو یہ فرمایا ہے کہ زمین میرے لئے سجدہ گاہ اور پاک و پاکیزہ قرار دی گئی اس کا مطلب کیا ہے۔

زمین کے مفہوم و معنی میں اختلاف

شیعوں کا نظریہ یہ ہے کہ زمین سے مراد وہی چیز ہے جس پر زمین کا اطلاق ہو یعنی یہی زمین جسے ساری دنیا زمین کہتی ہے۔ اس رو سے شیعوں کے نزدیک صرف زمین ہی پر سجدہ جائز ہے، ایسی کسی چیز پر نہیں جس پر زمین کا اطلاق نہ ہوتا ہو۔ اُنکے نزدیک زمین یہی زمین ہے اور وہ چیزیں جو اس سے اُگتی ہیں، خوردونوش کی اشیاً اور کانوں کو چھوڑ کر کیونکہ کھانے پینے کی چیزوں پر زمین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لہٰذا اُن پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر شیعوں کے نزدیک فرش و فروش، دری، قالین وغیرہ پر بھی سجدہ جائز نہیں۔ نہ لوہا، پیتل، تانبہ، سونا، چاندی اور ان جیسی معدنی اشیاء پر اور نہ معدنی پتھروں پر جیسے سنگ مرمر، نہ پھلوں اور میوہ جات، غلہ جات اور گوشت وغیرہ پر سجدہ کرنا صحیح ہے۔ کیونکہ ان چیزوں پر زمین کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی یہ چیزیں زمین کے زمرے میں آتی ہیں۔
چونکہ اس فقہی مسئلہ کی باریکیاں ہر شخص کی فہم سے بالاتر ہیں اور عام لوگ یہ سمجھنے

سے قاصر تھے کہ کس چیز پر سجدہ جائز ہے اور کس چیز پر نہیں، اس لئے ان پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے آسان صورت یہ اختیار کی گئی کہ خاک پر سجدہ کیا جانے لگا کیونکہ خاک پر سجدہ تو یقینی طور پر جائز ہے۔ اس حد تک تو شیعوں پر اعتراض کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں کہ وہ خاک پر کیوں سجدہ کرتے ہیں۔

اب رہ گیا اس مسئلہ کا دوسرا پہلو، وہ یہ کہ چونکہ ہر جگہ مٹی کا دستیاب ہونا مشکل ہے جیسے پختہ مکانات، پانی وغیرہ میں، نیز گر پڑ کر ضائع ہو جانے کے خوف سے اس کا ساتھ رکھنا یا ساتھ لے جانا بھی مانع ہے۔ لہذا لازم بنا کہ مٹی کا کوئی ڈھیلا ساتھ رکھا جائے تا کہ اس پر سجدہ کیا جا سکے۔ اُسکی مناسب صورت یہ ہے کہ گوندھی اور سکھائی ہوئی مٹی کا ٹکڑا ہو تا کہ شکست و ریخت نہ ہو سکے اور نماز میں بآسانی اس پر سجدہ کیا جا سکے۔ یہی گوندھی ہوئی مٹی کا ٹکڑا خواہ چکور ہو یا گول یا مستطیل، دشمنان تشیع کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے اور شیعوں پر طعن و تشنیع کرتے ہوئے اُسے طرح طرح کے نام دیتے ہیں۔ لوح، قرص اور نجانے کیا کیا۔ حالانکہ یہ ٹکڑا مٹی کا ہی ایک حصہ ہے جسے شیعہ سجدہ ریزی میں بروئے کام لاتے ہیں تا کہ ان کا ماتھا نماز پڑھتے وقت خاک کے بغیر کسی اور چیز پر نہ ٹکے۔ یہ صورت صرف سہولیت کی غرض سے اختیار کر گئی، پھر بھی حق یہ ہے کہ شیعوں کے نزدیک یہ بھی کوئی واجبی امر نہیں کہ جب بھی سجدہ کیا جائے تو سجدہ گاہ پر ہی کیا جائے۔ نہ اُسے ذاتی طور پر وہ کوئی قابلِ احترام چیز سمجھے جیسا کہ دشمنان تشیع شیعوں پر بہتان باندھتے ہیں۔ شیعہ ہر اُس چیز پر سجدہ کرتے ہیں جو زمین کا حصہ یا زمین سے اُگی ہوئی چیز ہو جیسے لکڑی، پتے وغیرہ۔

ویسے یہ بات بھی ایسی نہ تھی کہ جس کی بنیاد پر شیعوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا بس اُن کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ زمین کا مفہوم وہ نہیں سمجھتے جو دوسرے برادران اسلام سمجھتے ہیں۔ شیعوں کے نزدیک زمین یہی زمین ہے اور اُس سے اُگی ہوئی اشیاء، بشرطیکہ وہ

خوردونوش سے تعلق نہ رکھتے ہوں اور نہ ہی معدنیات ہوں جبکہ دیگر برادران اسلام ہر چیز پر سجدہ کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ شیعوں کے نزدیک نہ تو دری، چادر، قالین وغیرہ پر سجدہ کرنا جائز ہے، نہ لوہے، تانبے، چاندی، سونا وغیرہ پر، نہ معدنی پتھروں مثلاً سنگ مرمر وغیرہ پر ، نہ اُس مٹی پر جو آگ میں پکائی گئی ہو، نہ میوہ جات اور پھلوں پر، نہ گوشت اور غلہ جات وغیرہ پر کیونکہ اُن پر زمین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لہذا غور کریں کہ شیعوں کا عمل خدا اور رسولؐ کے ارشاد کے عین مطابق ہے یا دوسروں کا؟

دوسرا اختلاف

زمین کا تقدّس اور اُسکے جائے سجدہ ہونے کی گنجائش

دوسرا اختلاف شیعہ اور دیگر مسالک کے مابین نماز میں جائے سجدہ کے پاک ہونے کے تعلق سے ہے۔ شیعہ اس نظریے کے حامل ہیں کہ وہ زمین جس پر انسان سجدہ کرے اس کا پاک ہونا واجب ہے کیونکہ اس تعلق سے پیغمبر خداؐ کے یہ صریحی الفاظ ہیں:۔

جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مِسْجِدًا وَّ طَهُوْرًا

یعنی ''میرے لئے زمین جائے سجدہ اور پاک و پاکیزہ قرار دی گئی ہے۔''

یہ پاک و پاکیزہ کی لفظ دلالت کرتی ہے کہ جائے سجدہ کا پاک ہونا بھی انتہائی لازمی ہے، جبکہ دیگر فرقوں کے مسلمان اس کے قائل نہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے والا جس جگہ نماز کے لئے کھڑا ہو وہ پاک ہونا چاہیے، خواہ وہ سجدہ پاک چیز پر کرے یا نجس چیز پر۔ ایسا وہ کس دلیل کی بنیاد پر کہتے ہیں اس کی کوئی علمیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیعوں نے پاک و پاکیزہ مٹی کے ٹکڑے کو اختیار کیا تا کہ اُن کی جائے سجدہ پاک بھی ہو اور اُن چیزوں میں سے بھی ہو جس پر سجدہ جائز ہے۔

ہمیں اس مسئلے میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ بات ہمارے سامنے موضوع بحث سے خارج بھی تھی مگر چونکہ خاک کربلا کو سجدہ گاہ بنانے کے تعلق سے شیعوں پر طرح طرح کی تہمتیں عائد کی جاتی ہیں لہٰذا اس مسئلے کو واضح کردینا ضروری تھا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ شیعوں نے اپنے دینی مسائل اہلبیتؑ اطہار سے حاصل کئے جو معدن نبوت و رسالت ہیں۔ اُنہوں نے الفاظ شرعیہ کے معانی و مطالب ایران و توران کے غیر ملکیوں سے نہیں حاصل کئے تاکہ یہ کہا جاتا کہ اُنہوں نے الفاظ شرعیہ کے اصل معنی نہیں سمجھے۔ اُنہوں نے دین و مذہب ائمہ اطہارؑ سے حاصل کیا جو پیغمبرؐ کے لختِ جگر اور اُن کی آغوش میں پلے بڑھے تھے اور پیغمبر خداؐ سے بڑھ کر کوئی فصیح و بلیغ نہ ہوا۔ سیدھی سی بات ہے کہ ائمہ اطہارؑ دین اور شرعی مسائل کو جیسا سمجھ سکتے تھے غیر ممالک کے مسلمانوں کو ویسا سمجھنا بلکہ خود عربوں کا بھی اس طرح سمجھنا مشکل تھا۔ اسلئے کہ ائمہ اطہارؑ خالص عرب بھی تھے اور احکام شرعی اُن ہی کے گھر سے جاری ہوئے تھے۔ بہت سے صحابۂ کبار باوجودیکہ وہ عرصۂ دراز تک آنحضورؐ کی خدمت اقدس میں باریاب رہے، اس طرح شرعی مسائل کی باریکیوں کو نہ سمجھ سکے جس طرح کہ ائمہ طاہرینؑ نے سمجھا، حالانکہ وہ پیغمبرؐ خدا کے بہت بعد پیدا ہوئے۔ یہ ایک ناقابل تنسیخ حقیقت ہے کہ جب تک شریعتِ اسلامیہ موالی یعنی مفتوحہ ممالک کے مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں پڑی تھی تمام مسلمان شرعی مسائل کے ادراک و استنباط میں متحد و متفق رہے۔ مگر جب اہلِ عرب غیر ملکی فتوحات میں لگ گئے اور قرآن و حدیث کی خدمات تنہا موالی کے ہاتھ میں رہ گئیں تو ہر ایک نے اپنے سابق ملک و وطن اور قوم و قبیلہ کے افکار و نظریات کو پیش نظر رکھ کر قرآن و حدیث کے معانی و مطالب اخذ کئے۔

❀❀❀

سجدہ گاہ کے لئے خاک کربلا اختیار کرنے کی وجہ

کربلائے معلیٰ یا حائر حسینیؑ کی خاک کو سجدہ گاہ بنانے کی وجہ وہ احادیث ہیں جو اس سلسلہ میں ائمہ اطہارؑ سے مروی ہیں۔ دراصل یہ سلسلہ دور نبویؐ سے رائج پذیر ہے۔ ۳ھ ہجری میں پیغمبر خداؐ اور مشرکین کے درمیان مشہور جنگ اُحد برپا ہوئی تھی۔ اس جنگ میں پیغمبرؐ خدا کے سپہ سالار لشکر حضرت حمزہؓ جام شہادت نوش کر گئے۔ آپ پیغمبرؐ خدا کے چچا، رضاعی بھائی اور اسلام کے مشہور پاسبان اور محافظ تھے۔ آپ کی شہادت سے تمام مسلمانوں کو غیر معمولی صدمہ پہنچا۔ آنحضرتؐ کے حزن و ملال کی تو انتہا ہی نہ رہی۔ یہ سُن کر آپ کا کلیجہ اور بھی خون ہوا کہ ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے جناب حمزہؓ کے اعضائے بدن پارہ پارہ کیئے۔ آپ کا شکم مبارک پھاڑ ڈالا اور کلیجہ نکال کر چبانے کی کوشش کی۔ آپ کے اعضائے بدن کا ہار بنا کر گلے میں پہنا، کیونکہ جناب حمزہؓ نے جنگ بدر میں اُس کے باپ عتبہ کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ اس شدید ترین مصیبت پر اپنے انتہائی حُزن و غم کے اظہار کے لئے آنحضورؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ حمزہؓ کی صف ماتم بچھائی جائے اور اُن پر نوحہ و شیون کریں۔ جناب رسولؐ نے جناب حمزہؓ کو اتنی اہمیت دی، ان کی اتنی عزت بڑھائی اور اتنا غیر معمولی طور پر اُن کا غم منایا کہ مسلمان جناب حمزہؓ کی قبر کی مٹی بطور تبرک پاس رکھنے لگے۔ اس خاک سے تسبیحیں بنائی گئیں۔ بعض روایات سے تو صراحت ہوتی ہے کہ شہزادیٔ کونین حضرت فاطمہؑ بنت محمدؐ اسی پر عمل پیرا تھیں بلکہ آپ ہی سے اس عمل کا آغاز ہوا اور مسلمانوں نے آپ کی تقلید کی۔ حضرت حمزہؓ جب شہید ہوئے تو اُنہیں سیّد الشہداؑ کہا جانے لگا نیز اسد اللہ اور اسد رسول اللہؐ کے نام سے بھی آپ یاد کیئے جاتے تھے۔

اس تعلق سے علامہ مجلسیؒ نے ''مزار البحار'' میں بسلسلۂ اسناد ابراہیم بن محمد ثقفیؒ کی

ایک روایت نقل کی ہے۔ ابراہیم اپنے باپ سے ناقل ہیں کہ حضرت امام صادقؑ نے فرمایا:

''حضرت فاطمہؑ کی تسبیح پہلے بٹے ہوئے دھاگے کی ہوا کرتی، جس میں گرہیں پڑی ہوتیں۔ صدیقہ کبریٰ اسی تسبیح پر تکبیر و تسبیح پڑھا کرتیں۔ جب جناب حمزہؓ شہید ہوئے تو آپ نے ان کی خاکِ قبر سے تسبیح بنائی۔ مسلمانوں نے بھی آپ کی پیروی کی اور ایک مدت تک جناب حمزہؓ کی خاک قبر سے تسبیح بنانے کا رواج رہا، یہاں تک کہ امام حسینؑ شہید ہوئے۔ آپ کی شہادت کے بعد اس کام کیلئے آپ کی قبر مبارک کی خاک استعمال کی جانے لگی کیونکہ وہ زیادہ شرف و امتیاز کی حامل تھی''۔ (مزار البحار: ص ۱۴۶)

علامہ کاشف الغطأ اپنی کتاب ''الارض والتربتہ الحسینیہ'' کے صفحہ ۴۹ پر لکھتے ہیں:

''حضرت حمزہؓ میدان احد میں دفن ہوئے۔ آپ سیّد الشہداء کے لقب سے ملقب ہوئے۔ مسلمان آپ کی خاکِ قبر پر سجدہ کرتے تھے۔ جب امام حسین علیہ السلام شہید ہوئے پس آپ سیّد الشہد اُقرار پائے اور لوگ آپ کی خاک قبر پر سجدہ کرنے لگے۔''

اس سچائی سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ اسلامی اقدار کی احیأ و بقا اور انسانیت کی سربلندی کے لئے جام شہادت نوش کرنا، اپنا گھر بار نچھاور کر دینا بنی ہاشم کی اسی شاخ کا طرۂ امتیاز رہا۔ اولادان علیؑ و فاطمہؑ کے سوا دوسری شاخوں کو یہ شرف ہرگز حاصل نہ ہو سکا۔ جیسا کہ روایات دلالت کرتی ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کے دور تک شیعوں کا سجدہ کے بارے میں یہ دستور رہا کہ وہ ایک تھیلی میں خاک کربلا رکھتے اور نماز پڑھتے وقت اُسی خاک پر سجدہ کیا کرتے۔ ایک مدت تک یہی عمل رہا پھر آگے چل کر مٹی گوندھ کر اور سکھا کر اُس کی چھوٹی سی تختی بنالی گئی کہ اس طرح مٹی کے بکھر جانے کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔

چونکہ پیشانی کو گرد آلودہ کرنا اور زمین پر سجدہ کرنا واجب ہے کیونکہ اس طرح خالق کائنات کے حضور انتہائی خاکساری اور فروتنی کا اظہار ہوتا ہے اور زمین سے اُگی ہوئی

چیزوں جیسے پتوں اور لکڑی پر سجدہ کرنا سنت ہے۔ اس اعتبار سے ایسی تربت پر سجدہ کرنا تو کہیں زیادہ بہتر و افضل ہوگا جو ہر خاک سے مقدّس ترین اور سب سے زیادہ طیّب و طاہر ہو، یعنی خاک قبر امام حسینؑ کہ جس کی فضیلت میں رسول خداؐ کے بہت سے احادیث وارد ہوئی ہیں۔ حائر حسینیؑ کی خاک افضل ترین خاک ہے۔ یہ تربت اُس پاک و صاف اور سُرخ رنگ کی مٹی سے حاصل کی جاتی ہے جو دریائے فرات پہاڑوں کی بلندیوں اور وادیوں کے دامن سے لالا کر سرزمین کربلا کے دونوں اطراف بکھیرتا رہتا ہے۔ یہ مٹی کربلا کی پاک و پاکیزہ مٹی سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔ فرات سے ہو کر یہ مٹی نہروں میں آکر بیٹھ جاتی ہے اور اسی خاک سے سجدہ گاہیں بنائی جاتی ہیں جن پر شیعہ نماز میں سجدہ کرتے ہیں۔ اس میں آخر کون سی قباحت ہے اور شیعوں کو کیوں نشانۂ ہزیمت بنایا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی عیاں ہے کہ یہ سجدہ گاہیں خاص قبر کی مٹی سے نہیں بنتیں۔ اُس سے بننا ممکن بھی نہیں کیونکہ اس تک پہنچنا محال ہے۔ روضہ کی سرزمین رنگ برنگی معدنی پتھروں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ابتدائی دور میں جب کہ روضۂ مبارکہ اس تزک و احتشام کا نہیں تھا حائر کی مٹی یا قبرِ مبارک کے نزدیک کی کچھ مٹی لوگوں کے ہاتھ لگ جاتی ہو لیکن آج کل تو یہ بالکل ناممکن سی بات ہے اور جو شخص بھی اس کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا اور کاذب ہے۔

واقعہ کربلا کے بعد ائمہ اطہارؑ کا عمل اور خاکِ قبر حسینیؑ پر اُنکے سجدے

شروع شروع میں یہ دستور رہا ہے کہ لوگ قبر مبارک یا اُس کے آس پاس کی جگہ خاصکر قبر مبارک کے سرہانے کی مٹی لے کر سجدہ کیا کرتے۔ پہلے امام زین العابدینؑ نے اس خاک کو سجدہ کیلئے استعمال کیا (دیکھئے علامہ کاشف الغطاءؒ کی کتاب 'الارض والتربتہ الحسینیہ' ص ۵۱) کیونکہ آپ جب اپنے والد ماجد اور دیگر شہدائے کربلا علیہم السلام کے دفن سے فارغ ہوئے تو جس جگہ آپ نے امام حسینؑ کو دفن کیا تھا وہاں ایک مٹھی تربت لے کر

ایک تھیلی میں محفوظ کرلیا اور اس سے آپ نے ایک سجدہ گاہ اور تسبیح تیار کی ۔ یہ وہی تسبیح تھی جسے حضرت امام سجادؑ اپنے ہاتھوں میں پھرایا کرتے اور یزید کے پوچھنے پر آپ نے پیغمبرؐ خدا کی ایک حدیث بیان کی جس کی تلخیص یوں ہے کہ اگر کوئی شخص علی الصباح ہاتھوں میں تسبیح لیے رہے اور مخصوص دُعا پڑھے، اُس کیلئے ہمیشہ تسبیح کا ثواب لکھا جاتا رہے گا چاہے وہ تسبیح نہ بھی پڑھے ۔ جب آپ زندان شام سے رہا ہو کر اہلِ حرم کے ساتھ مدینہ پہنچے تو آپ اس خاک قبر حسینیؑ سے خیر و برکت حاصل کیا کرتے اور نماز پڑھتے وقت اُسی پر سجدہ کیا کرتے ۔ گھر میں کوئی بیمار ہوتا تو اس سے علاج کرتے ۔ آپ کا دیکھا دیکھی کہ سادات علویین اور ان کے پیروکاروں میں بھی اس کا رواج ہو گیا ۔ (الارض والتربتہ الحسینیہؑ: ۵۰ـ۵۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے تربت قبر حسینیؑ کو امام زین العابدینؑ نے سجدہ میں استعمال کیا ۔ آپ کے بعد دیگر ائمہ اطہارؑ بھی اس طریقۂ کار پر کار بند رہے، آپ کے فرزند امام محمد باقرؑ اپنے اصحاب کو بڑی سرگرمی سے اسکی طرف متوجہ کیا کرتے اور اس خاک کی فضیلت و برکات کی نشر و اشاعت کرتے رہے ۔ (الارض والتربتہ الحسینیہؑ: ص۵۲)

حضرت امام جعفر صادقؑ کے دور میں یہ سلسلہ مزید آگے بڑھا ۔ آپ خاص طور اپنے شیعوں میں شد و مد سے کربلا کے فضائل و مناقب اور اُس کی پاکیزگی کا تذکرہ کیا کرتے ۔ آپ کے عصر میں شیعوں کی تعداد بھی کافی بڑھ چکی تھی اور بلحاظ تہذیب و تمدن، علوم و فنون اُن کا شمار اہم ترین اسلامی فرقوں میں ہوتا تھا، آپ شیعوں کو برابر ترغیب و تحریک دلایا کرتے کہ تربت قبر حسینیؑ سے برکت حاصل کریں اور اُس پر سجدہ کیا کریں ۔

شیخ طوسیؒ اپنی کتاب ''مصباح'' میں معاویہ بن عمارؓ سے کچھ اس طرح روایت کرتے ہیں:ـ

''امام جعفر صادقؑ کے پاس زرد رنگ کے ریشمی کپڑے کی ایک تھیلی تھی،

جس میں امام حسینؑ کی قبر کی تربت تھی۔ جب نماز کا وقت ہوا تو آپ نے جائے نماز پر اُس خاک کو اُنڈیل دیا۔ جب سجدہ میں گئے تو اُسی خاک پر سجدہ کیا۔"

پھر آپ نے فرمایا:۔

"تربت قبر حسینؑ پر سجدہ کرنا سات پردوں کو چاک کر دیتا ہے"۔

(مصباح المتہجد: ص ۵۱۱: مطبوعہ طہران: ۱۳۳۸ھ، المزار: ص ۱۴۳)

آپ جب تک بقیدِ حیات رہے آپ کا یہی طرزِ عمل رہا۔ صاحب "وسائل" ویلمی سے نقل کرتے ہیں:۔

"امام جعفر صادقؑ خداوند عالم کے حضور اپنی عاجزی و خاکساری کے اظہار کیلئے صرف خاک قبر حسینؑ پر سجدہ کیا کرتے۔" (الارض والتربتہ الحسینیہؑ: ص ۵۳)

دیگر ائمہ اطہارؑ بھی اپنے شیعوں اور پیروکاروں کو اس کی ترغیب دلایا کرتے۔ جس کے نتیجے میں ہر دور میں شیعہ اس کے پابند رہے اور آج تک پابند ہیں اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد مٹی گوندھ اور سکھا کر سجدہ گاہ بنا لینے کا طریقہ رائج ہو گیا جیسا کہ آج کل سجدہ گاہیں پائی جاتی ہیں۔ سرزمین حائر کی خاک سے بنی ہوئی سجدہ گاہ کی تاریخی سند بھی ملتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری کے وسط ہی سے اس کا سلسلہ جاری ہے یعنی حضرت حُجتؑ کے زمانہ سے۔ اس تعلق سے طبرسیؒ نے محمد بن عبداللہ بن جعفر حمیریؒ سے روایت کی ہے کہ:۔

"ابن حمیریؒ نے حضرتؑ کو خط لکھ کر دریافت کیا تھا کہ خاکِ قبر سے بنی ہوئی سجدہ گاہ پر سجدہ کرنے میں کوئی فضیلت ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں جائز ہے اور اس میں فضیلت بھی ہے۔" (الحدائق الناضرہ جلد: ۳ ص ۱۷۹)

حضرت حجتؑ سے اس تسبیح کی فضیلت میں ایسی ہی اور بھی احادیث منقول ہے۔

(ملاحظہ ہو الحدائق الناضرہ: جلد ۳، ص ۳۲۴، المزار: ص ۱۴۶)

تُربت امام حسینؑ کو سجدہ گاہ بنانے کی وجوہات

نماز میں سجدہ کے لئے قبر اطہر یا حائر حسینیؑ یا کربلائے معلیٰ کی مٹی کو ترجیح دینے کی وجہ کے علاوہ ان احادیث کے جو اس خاک کی فضیلت اور تقدس کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، علاوہ اس سبب کے کہ یہ تربت دنیا بھر کی خاک سے اشرف وافضل تر ہے، علاوہ اس کے کہ کوئی بھی خاک اس کی ہم پلہ نہیں، علاوہ اس کے کہ اس خاک پر اللہ تعالیٰ کیلئے سجدہ کرنے کی بڑی فضیلت ہے، سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس خاک پر سجدہ کرتے وقت، نماز پڑھنے والے کو دین اسلام کی وہ شدید ترین مصیبت اور تباہی یاد آجاتی ہے جو فرزندرسولؐ کی شہادت کے سبب اس پر نازل ہوئی۔ جو اس باغی گروہ کے ہاتھوں انجام پائی جو اسلام اور مسلمانوں کا دورِ جاہلیت میں بھی دشمن رہا اور مسلمان ہونے کے بعد بھی۔

دورِ جاہلیت میں اس گروہ نے عم پیغمبرؐ حضرت حمزہؓ کو شہید کر کے اُس کا انتہائی بھیانک طریقے سے مثلہ کیا۔ ان کی ہمیشہ یہی پوری کوشش رہی کہ اسلام کو بیخ و بن سے ہی اُکھاڑ پھینکیں۔ تمام مسلمانوں نے حضرت حمزہؓ کی شہادت کو اپنے لئے سخت ترین مصیبت سے تعبیر کیا، آپ کی یاد برابر تازہ رکھنے کے لئے آپ کی خاک قبر کو تبرک سمجھا، اس سے شفا چاہی اور اِسے سجدہ گاہ بنایا۔ زمانہ اسلام میں اس گروہ نے آنحضورؐ کے لختِ جگر حضرت امام حسینؑ کو شہید کر کے پھر ایک مرتبہ کوشش کی کہ پیغمبرؐ کا نام و نمود مٹ جائے کیونکہ اُس وقت روئے زمین پر آپ کے سوا رسولؐ کا اور کوئی فرزند موجود نہیں تھا۔ دشمنوں نے آپ کو شہید کر کے دعوت اسلامیہ اور نبوت کا نام و نمود مٹا ڈالنے کی ٹھانی۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت عظمیٰ کے بعد مسلمانوں نے آپ کی خاک قبر کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس خاک پر وہ اللہ تعالیٰ کا سجدہ بجالاتے اور یاد کرتے کہ یہ نماز حسینؑ اور اُن کے اعزّ و

اصحاب کی شہادت کی بدولت ہی قائم ہوئی۔ اگر حسینؑ کربلا میں اپنی اور اپنے اصحاب و اقارب کی قربانی پیش نہ کرتے تو اس نماز کا وجود بھی مٹ گیا ہوتا۔

علامہ کاشف الغطاء رقم طراز ہیں:۔

''خاکِ کربلا پر سجدہ ریز ہونے کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ نماز گزار سجدہ میں پیشانی رکھتے وقت مولا حسینؑ اور آپ کے اصحاب و اقارب کی وہ عظیم ترین قربانی یاد کرے جو اُنہوں نے دینِ اسلام کے اصول و عقائد کی احیائ و بقا اور ظلم و استبداد اور فتنہ و فساد کا قلعہ قمع کرنے کے سلسلے میں پیش کیں۔ چونکہ سجدہ ارکان نماز میں سے سب سے اہم رکن ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ بندہ سجدہ کی حالت میں اپنے رب سے زیادہ قریب ہوتا ہے لہذا مناسب ہے کہ نماز گذار اس خاک پر پیشانی رکھتے وقت ان شہیدانِ راہ خدا کی یاد تازہ کرے، جنہوں نے راہِ حق میں اپنا جسم و جان نثار کر دیا۔ اس طرح اُس میں انکساری و فروتنی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اس دنیا اور اس کی نعمات و لذائذ کو حقیر سمجھے گا۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے جو فرمایا ہے کہ خاکِ قبر حسینؑ پر سجدہ کرنے سے سات پردے اُٹھ جاتے ہیں غالباً اس سے یہی مقصود ہے۔'' (الارض والتربتہ الحسینیہؑ: ص۴۲،۴۳)

اسی سلسلے میں علامہ موصوف آگے خامہ فرسا ہیں:۔

''کیا یہ فخر کی بات نہیں کہ زمین کا سب سے مقدس ترین حصہ زمانے کی سب سے معزّز شخصیت کی آرامگاہ بنے۔ بے شک یہ دنیا برابر کھنگالی جاتی رہی کہ وہ انسانیت کی مکمل ترین شخص، انسانی کمالات و محاسن کی جامع ترین ہستی اور اعلیٰ ترین ملکوتی روح کی حامل شخصیت کو عالم وجود میں لائے۔ چنانچہ یہ دنیا ایک نور واحد کو منظر عام پر لائی جس کے دو حصے کیے گئے۔ ایک تمام نبیوں کے سیّد و سردار حضرت محمد مصطفیٰؐ اور دوسرے تمام اوصیاء کے سیّد و سردار علیؑ مرتضیٰؑ۔ پھر اللہ عزّ و جل نے دونوں حصوں کو ایک مرتبہ پھر

ایک جگہ مجتمع کردیا اور وہ حسینؑ کی ذات تھی جس میں دونوں نور اکٹھا ہو گئے اور جو دونوں جوہروں کے خلاصہ تھے جیسا کہ پیغمبر خداؐ کا ارشاد ہے حسینؑ مجھ سے ہیں اور میں حسینؑ سے ہوں۔ پھر یہ دنیا قیامت تک کے لئے ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہو گئی اور جب زمین کا یہ حق ہے کہ اُس پر اللہ کا سجدہ بجالایا جائے اور زمین کے سوا اور کسی چیز پر سجدہ نہ کیا جائے۔ لہذا مناسب ترین بات یہ ہے کہ ایسی خاک پر سجدہ ہو جو روئے زمین کی ہر خاک سے مقدس تر ہو اور وہ تربتِ قبر حسینؑ ہے اور اس کی وجہ فقط یہ ہے کہ خاک کربلا بلحاظ مادہ وعنصر کے تمام خطہ ہائے زمین سے مکرم تر اور مقدس تر ہے جیسا کہ علامہ علائلی نے اپنی کتاب ''سموالمعنیٰ'' میں اور علامہ عباس محمود العقاد نے اپنی ''ابو الشہدا'' کے صفحہ ۱۵۴ پر صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ (الارض والتربۃ الحسینیہؑ: ۴۷،۴۷)

کسی چیز کو سجدہ کرنے اور کسی چیز پر سجدہ کرنے میں فرق

دشمنان تشیع جو تربتِ قبر حسینؑ پر سجدہ کرنے کے بارے میں شیعوں پر گونا گوں تہمتیں عائد کرتے ہیں یا تو اس بات کو نہیں سمجھ سکے کہ کسی چیز پر سجدہ کرنے اور کسی چیز کو سجدہ کرنے میں بہت بڑا فرق ہے یا اُنہوں نے عمداً دونوں چیزوں کو مخلوط کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ سیدھے سادھے اور جاہل لوگوں کو شیعوں کے خلاف برانگیختہ کرنا اور اُنہیں شیعہ دشمنی پر آمادہ کرنا اسی صورت میں ممکن تھا اور اسی باعث مسلمانوں میں پھوٹ پڑ سکتی تھی۔ حالانکہ معمولی عقل والا بھی یہ بات بآسانی اخذ کرسکتا ہے کہ سجدہ خواہ خاک پر کیا جائے یا دری، قالین یا فرش وفروش پر ہر حال میں اللہ کے لئے ہوتا ہے۔ خاک پر سجدہ کرنا واجب بھی ہے اور اس میں فروتنی وخاکساری کا زیادہ اظہار ہوتا ہے اور خاک کے علاوہ دوسری چیزوں پر سجدہ کرنا زیادہ سے زیادہ جائز کہا جا سکتا ہے اور دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر

ہے۔حضرت امام جعفر صادقؑ جب سجدہ کرتے تو خاک قبر حسینؑ پر کرتے کہ اس طرح خاکساری وانکساری کا زیادہ اظہار ہوتا ہے"۔(الارض والتربتہ الحسینیہؑ:۵۳بحوالۂ وسائل)

ان سجدوں کی عزّ وشرف کا کون اندازہ کرسکتا ہے جو حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے جد پاک کی خاک پر کیا کرتے۔خاک پر سجدہ کرنے میں انتہائی عاجزی وانکساری کا اظہار بھی تھا اور جد مظلومؑ کی شہادت پر صبر وشکر اور تسلیم ورضا کا عنصر بھی شامل حال تھا اور اسی دستور پر آپ کے شیعہ بھی عمل پیرا ہیں۔

گو کہ سجدہ صرف اللہ کیلئے ہوتا جس طرح دری یا قالین پر سجدہ کرنے والے کے متعلق یہ سمجھنا لغو ہے کہ دری قالین کو سجدہ کررہا ہے اسی طرح خاک قبر حسینؑ پر سجدہ کرنے والے کے متعلق بھی یہ سمجھنا کہ وہ حسینؑ کو سجدہ کررہا ہے انتہائی مہمل ہے۔حسینؑ معبود نہیں تھے بلکہ وہ خدا کے نیکوکار بندوں میں سے تھے۔اُن کی تربتِ قبر پر سجدہ کرنا خدائے واحد وقہار کا سجدہ بجالانا ہے نہ کہ کسی اور چیز کا جیسا کہ دشمنانِ تشیع شیعوں پر الزام تراشتے ہیں۔

علامہ محمد حسین آل کاشف الغطاؒ اس سلسلے میں خامہ فرسا ہیں:۔

"دشمنان تشیع کا یہ الزام انتہائی حماقت یا اُن کی جاہلانہ عصبیت ہے کہ یہ خاک (کربلا) جس پر شیعہ سجدہ کرتے ہیں، یہ شیعوں کا بت ہے جسے وہ سجدہ کیا کرتے ہیں، حالانکہ شیعہ اُٹھتے بیٹھتے اعلان کرتے رہے اور اپنی کتابوں میں وضاحت کیا کرتے رہے کہ سجدہ صرف اللہ کو کیا جاتا ہے۔خاک پر سجدہ کرنا بھی اللہ ہی کو سجدہ کرنا ہے۔ لیکن دشمنانِ تشیع کو یہ فرق نہ معلوم ہوسکا کہ کسی چیز پر سجدہ کرنا اور بات ہے اور کسی چیز کو سجدہ کرنا اور بات ہے۔سجدہ صرف اللہ ہی کو کیا جاتا ہے۔لیکن مقدس زمین اور پاک وپاکیزہ خاک پر ملائکہ نے جو آدمؑ کو سجدہ کیا تھا وہ بھی اللہ ہی کیلئے اور اللہ ہی کے حکم سے تھا جناب آدمؑ کی عزّت افزائی کیلئے"۔ (الارض والتربہ:ص ۴۷۔۴۸)

پس یہ گمان بھی اس سے بڑھکر احمقانہ ہے کہ شیعہ خاک کربلا پر سجدہ کرنا لازمی سمجھتے ہیں اور اُن کے نزدیک اس کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی۔

کسی عالم اہلسنت کا واقعہ ہے کہ وہ نجف اشرف گئے اور وہاں کے کسی مشہور شیعہ عالم سے ملاقات کی۔ گفت وشنید کے دوران اُنہوں نے سجدہ گاہ کے متعلق سوال کیا۔ اس کی غرض وغائت شیعوں کے خلاف مواد اکٹھا کرنا تھا اور ایسا ثبوت جس سے ان الزامات کی تصدیق وتوثیق ہو سکے جو اہلسنت کی طرف سے اس سجدہ گاہ کے تعلق سے شیعوں پر عائد کرتے ہیں۔ وہ شیعہ عالم اس کا مطلب اخذ کر گئے۔ اُنہوں نے تسلی بخش جواب دیا۔ پھر ایک سجدہ گاہ کو لے کر پہلے اُسے بوسہ دیا، اپنی پیشانی اور سر پر رکھا اور کہا کہ میں اس کا احترام کر رہا ہوں، اسلئے کہ خدا کا سجدہ کرنے میں اس پر پیشانی ٹکتی ہے۔ پھر اُس سجدہ گاہ کو پھینک دیا اور کہا میں ایسا اسلئے کر رہا ہوں کہ یہ صرف ایک مٹی کا ایک ٹکڑا ہے اور کچھ نہیں۔ وہ سُنی عالم رسوا ہو گیا اور اُس سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے کہ مسٹر رابلی جو حکومت عراق کے قانونی مشیر تھے کربلا کی سیاحت کو آئے۔ اُن کے ہمراہ وزارتِ قانون کا ایک سیکریٹری بھی تھا۔ یہ مسٹر رابلی اصل میں پادری تھا اور اندر ہی اندر ایسی باتوں کی تحقیق کیا کرتے جن سے مسلمانوں کو مطعون کیا جا سکے۔ بغداد میں شیعوں کے خلاف اُن کے کان کافی بھرے گئے تھے۔ وہ کربلا کے بازاروں میں گھوم رہا تھا کہ ایک دوکان کے پاس سے گزر ہوا جہاں تسبیح اور سجدہ گاہیں فروخت ہو رہی تھیں۔ اُنہوں نے حیرت بھرے لہجے میں سیکریٹری سے پوچھا یہ کیا ہے۔ سیکریٹری نے برجستہ کہا یہ خاک کربلا ہے۔ اس کی مثال ویسی ہے جیسے کلیسائے پطرس کی کنکریاں، جو آپ لوگوں کے یہاں زائرین کے ہاتھوں ایک ایک فرانک میں فروخت ہوا کرتی ہیں۔ مسٹر رابلی کو یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ سیکریٹری کی طرف سے ایسا

برجستہ جواب ملے گا۔ اُنھوں نے قہقہہ لگایا اور بولا سچ کہتے ہو ہم لوگ بھی یورپ میں ایسے ہی چیزوں کے عادی ہیں اور اس میں اچھنبے کی کوئی بات نہیں ۔ جو بھی روم کے اس مشہور گرجا کی زیارت کو جاتا ہے وہ وہاں بطور تبرک اور بغرض شفا کنکریاں ضرور خریدتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذہبی چیزوں کی عزت و احترام کا دستور سارے ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ کوئی بھی قوم یا ملک اس سے مبّرا نہیں۔

یہ سمجھنا انتہائی غلط ہوگا کہ علمائے اہلسنت اس قسم کے علمی حقائق سے نابلد ہیں اُنہیں جیسے خبر ہی نہیں کہ کسی چیز پر سجدہ کرنا اور بات ہے اور کسی چیز کیلئے سجدہ کرنا اور بات، لیکن اس احمقانہ تعصب کا ستیاناس ہو جو اُن کے اور حقیقت کے درمیان حائل ہے۔

شیعہ جو رسول خداؐ اور آپ کے اہلبیتؑ کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں خصوصاً امام حسینؑ کی تعظیم اور آپ کی تربتِ قبر پر اللہ تعالیٰ کا سجدہ بجالاتے ہیں یہ دراصل خاندان بنی اُمیہ کی سرکوبی اور شکست وریخت ہے۔ دراصل یہی بات بعض لوگوں کو کھٹکتی ہے۔ اُنکے دل کو گوارا نہیں کہ بنی اُمیہؒ پر کوئی آنچ آئے، اسی لئے شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ کیوں ایسے شخص کی خاک قبر پر اللہ تعالیٰ کا سجدہ بجالاتے ہیں جنہیں امویوں نے شہید کیا تھا۔ ان لوگوں کی نظر میں بنی اُمیہ ہی اصل عرب، محورِ ایمان، اسلام کا معدن اور حقیقت دین ہیں۔

اس حقیقت سے کوئی جاہل و غافل انسان ہی انکار کرسکتا ہے کہ بنی ہاشم کے خلاف بنی اُمیہ کی ساری تحریکات دور جاہلیت میں بھی اور ظہور اسلام کے بعد بھی سراسر دشمنی، عداوت، بے جا تعصب، مادہ پرستی اور نفع اندوزی پر مبنی تھیں۔ دونوں ادوار میں اُنہیں ان گنت بوالہوس عناصر بطور معاون و مددگار ملتے رہے جو ان کے مشن کو بڑھاوا دیتے رہے۔ لہذا ہمیں جو کچھ بھی دیکھنے اور سننے کو ملے اُس پر تعجب نہ ہونی چاہیے۔

چھٹی فصل

حائر حسینیؑ پر حاضری اور اُس کی زیارت کے آداب

تاریخ واحادیث گواہ ہیں کہ حائر حسینیؑ کی حیثیت محض ایک مذہبی ودینی عبادت گاہ کی نہ رہی کہ زائرین جب چاہیں اور جسطرح چاہیں جاکر زیارت کریں یا زیارت کے نہ کوئی مخصوص مراسم ہوں اور نہ کوئی مقررہ آداب۔ یہ سرزمین ابتدائے آفرینش سے ہی سے انتہائی محترم ومکرم رہی۔ اسلام میں بھی اس کی رفعت ومنزلت کا پوری طرح لحاظ رکھا گیا۔ اس تعلق سے اس سرزمین پر حاضری کے کچھ مخصوص آداب اور معیّن مراسم ہیں جو زیارت کی بنیادی شرائط ہیں اور جن کی پابندی زائر کیلئے لازمی ہے اس لئے کہ حائر حسینیؑ حرمِ خدا اور حرم رسولؐ سے ایک حرم ہے جیسا کہ احادیث میں وارد ہوا ہے۔

(کامل الزّیارت: ص ۱۹۸)

ائمہ معصومینؑ نے حضرت امام حسینؑ کی زیارت کے بہت سے اعمال وعبادات مقرّر ومختص فرمائے ہیں اس لئے کہ زائر حائر حسینیؑ میں پہنچ کر اسلام کی عظیم ترین شخصیت کے حضور میں حاضر ہوتا ہے جو فرمانِ خداوندی کے مطابق زندہ ہے مُردہ نہیں:۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ

(جو لوگ راہ خدا میں قتل ہوئے اُنھیں مُردہ نہ سمجھا کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں رزق پاتے ہیں۔)

خداوند کریم کے نزدیک حضرت امام عالی مقامؑ اور آپکے اصحاب سے بڑھ کر اور کون شہید اعظم ہوسکتا ہے کہ ایسی شہادت کی نظیر پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے۔ اسلام

میں بس شہدائے بدر تو اُنکے ہم پلہ قرار دیے جاسکتے ہیں، جنہوں نے کسی دنیاوی حرص اور لالچ کے بغیر محض اسلام کی بنیادیں مضبوط کرنے کیلئے اپنے کوراہِ خدا میں قربان کردیا تھا اور اُنکے علاوہ کوئی اور اُن کے ہمسر نہیں ہوسکتا۔

بہرحال ائمہ ہدیٰؑ کی معین کردہ اعمال وعبادات دو قسم کے ہیں۔ کچھ تو تزکیۂ نفس اور اسلامی اخلاق وکردار سے متصف ہونے کے متعلق ہیں اور کچھ کیفیتِ زیارت کی نسبت سے کہ جب زائر زیارتِ امام حسینؑ کے مقصد سے گھر سے نکلے تو کس طرح نکلے اور حائر مقدس پہنچے تو کس ڈھنگ سے، پھر غاضریہ ونینویٰ سے چل کر حائر حسینیؑ میں کیسے داخل ہوجائے، پھر حائر حسینیؑ سے قبر حسینیؑ پر پہنچنے تک سارے آداب وضوابط شامل ہیں۔

وہ اعمال وعبادات جو تزکیۂ نفس اور اسلامی اخلاق کردار سے متصف ہونے سے تعلق رکھتے ہیں، اس سلسلے میں محمد بن مسلمؒ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا:۔

"کیا ہمارا زیارتِ امام حسینؑ کا سفر کرنا ویسا ہی سفر ہے جس طرح ہم حج کیلئے سفر کیا کرتے ہیں؟، امام نے فرمایا ہاں! میں نے عرض کیا تو جس طرح حاجیوں کو زادِ راہ اور سامان سفر ضرور ہوا کرتا ہے کیا زائرین کیلئے بھی اسی طرح ضروری ہے؟ درجواب حضرت امام جعفر صادقؑ نے وضاحت فرمائی کہ زائرین کیلئے کیا کیا روحانی سامان ہمراہ ہونا چاہیے۔ آپ نے فرمایا:

"تمہارے لئے لازم ہے کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ کم بولو اور جب بولو تو اچھی بات منہ سے نکلے۔ زیادہ سے زیادہ ذکرِ خدا زبان پر وردرہے، کپڑے صاف وپاک ہوں، حائر پہنچنے سے پہلے غسل کرو۔ انکساری وفروتنی کا دامن پکڑو۔ بکثرت نمازیں پڑھا کرو، آلِ محمدؐ کے لئے دعائے رحمت کریں، تمہارے لئے

لازم ہے کہ نگاہیں نیچی رہیں۔ اپنے محتاج بھائیوں کے دُکھ درد میں شریک ہو، اگر وہ تم سے الگ تھلگ رہیں تو تم خود اُن کے پاس جاؤ۔ تمہارے لئے تقیہ بھی ضروری ہے جس سے تمہارا دین قائم ہے۔ جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے اُن سے احتراز کرو، جب یہ سب کام تم کرو گے تو تمہارا حج بھی پورا ہوگا اور عمرہ بھی اور تم ان مرادوں کے پانے کے مستحق ہوں گے جن کا تم اللہ سے سوال کرتے ہو۔'' (کامل الزیارت: ص ۱۱۳-۱۱۴)

اس حدیث سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ائمہ معصومینؑ حائر مقدس اور اس کی زیارت کو کتنی اہمیت دیا کرتے تھے اور زیارت امام عالی مقامؑ کو تہذیب نفس، روح کی جلا، اسلام کی بنیادی باتوں کی ترویج اور اسلامی خوبیاں پھیلانے میں کس قدر عمل دخل حاصل ہے۔ اسی طرح حائر مقدس میں جانے اور زیارت امام مظلومؑ بجالانے کے بھی اپنے معین اور مخصوص آداب و اعمال ہیں جو زیارت کی کتابوں میں صراحت کے ساتھ مرقوم ہیں۔ جنہیں ہم بخوف طوالت حذف کرتے ہیں۔

ساتویں فصل

حائر حسینیؑ کی زیارت کے مخصوص دن

چونکہ حائر حسینیؑ انتہائی متبرک اور مکرّم مذہبی مقامات میں سے ہے، اس کی فضیلت وعظمت کے تعلق سے ان گنت احادیث وارد ہوئی ہیں۔ مسجد الحرام اور مسجد نبوی کے بعد اُسے تیسرا حرم گردانا جاتا ہے۔ لہٰذا حائر بھی مسلمانوں کی اسی طرح زیارت گاہ قرار پایا جس طرح خانۂ کعبہ مسلمانوں کی زیارت گاہ ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی زیارت سال میں ایک مرتبہ ہوتی ہے۔ خدا جسے توفیق مرحمت کرتا ہے تو وہ حج کی عبادت بجالاتا

ہے جبکہ حائر حسینیؑ کی سال میں زیارت کئی مرتبہ بجالائی جاتی ہے۔احادیث میں زیادہ سے زیادہ مرتبہ زیارت بجالانے پر اصرار ہوا ہے کیونکہ زائر حسینیؑ کو ایک مرتبہ زیارت بجالانے کا اتنا ہی ثواب ملتا ہے جتنا ایک مرتبہ حج بجالانے کا بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

حائر حسینیؑ کی زیارت دو طرح کی ہوتی ہے ایک روز مرّہ کی زیارت اور دوسری مخصوص زیارت۔ روز مرّہ والی زیارت تو ہر وقت بجالائی جاسکتی ہے۔رات دن، صبح وشام غرضکہ اس کیلئے وقت کی کوئی قید نہیں، روضۂ حسینیؑ طلوع آفتاب سے لیکر رات کے بارہ بجے تک کھلا رہتا ہے اور ہر وقت زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے اور زیارت بجالائی جارہی ہے جبکہ مخصوص زیارت سال میں آٹھ مرتبہ بجالائی جاتی ہے، اُن زیارتوں کو زیارت مخصوصہ کہا جاتا ہے اور قریب ودُور غرض ہر جگہ سے زائرین یہ زیارات بجالانے کیلئے جوق در جوق آتے ہیں۔ان مخصوص زیارتوں میں سے اکثر کے متعلق ائمہ اطہارؑ سے بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں۔(۱) ۱۰ ارمحرم کی زیارت جو زیارت عاشور کے نام سے مشہور ہے۔ (۲) زیارت اربعین (۳) زیارت یکم رجب (۴) زیارت ۱۵ ار رجب (۵) زیارت ۱۵ ارشعبان (۶) زیارت شبہائے قدر ماہ رمضان المبارک (۷) زیارت عید الفطر (۸) زیارت عرفہ اور عید الاضحیٰ۔ یہ آٹھوں زیارتیں اہمیت کے لحاظ سے نہ ہی ہم مرتبہ ہیں اور نہ ہر ایک میں یکساں اجتماع ہوتا ہے۔ان میں بعض تاریخیں (جیسے عاشورا اور اربعین) کافی اہم ہیں۔ان مواقع پر زائرین کا اتنا بڑا ہجوم اکٹھا ہوجاتا ہے جتنا حج کے موقعے پر مکہ معظمہ میں حاجیوں کا ہجوم ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھکر۔کربلا جیسے بڑے شہر میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں بچتی۔کسی سال تو بعض مخصوص ایام میں زائرین کا اتنا غیر معمولی اور بے پناہ ہجوم اُمڈ آیا کہ حکومت عراق سڑکیں کشادہ کرنے پر مجبور ہوئی اور اسی بہانے بہت سے لوگوں کے گھر منہدم کردیے گئے۔بہت سے مدارس، مساجد اور حائر مقدس سے متصل

تاریخی عمارات زمین بوس کردی گئیں۔ ان تاریخی عمارتوں کے منہدم کردیے جانے کی وجہ سے اصل روضہ کی عمارت کی وہ شان وشوکت اور علمی وجاہت ومنزلت بے حد متاثر ہوئی جو گذشتہ صدیوں میں سلاطین وامراء کے ہاتھوں اسے حاصل ہوئی تھی۔ پہلے عباسیوں کے دور میں، پھر سلاطین آل بویہ کے عہد میں، پھر جلائری بادشاہوں کے زمانے میں اور آخر میں صفوی وقاچاری بادشاہوں کے ہاتھوں بڑی نادرِ روزگار عمارتیں حائرِ مقدس کے چہار جوانب تعمیر کی گئیں تھیں۔ ۱۳۵۴ھ ہجری میں حکومتِ عراق کے حکم سے کربلا کے کلکٹر عبدالرسول خالصی نے ان تمام عمارتوں کو یہ خیال کئے بغیر کہ یہ فنِ تعمیر کے لحاظ سے شاہکار تاریخی عمارات ہیں صفحۂ ہستی سے نابود کردیا۔ خالصی نے ان عمارتوں کا یوں صفایا کرایا جیسے یہ قومی سرمایہ نہیں بلکہ مٹی کا ڈھیر تھیں۔ حالانکہ سڑکیں کشادہ کرنے کیلئے اور بھی بہت ساری صورتیں تھیں اور ان عمارتوں کو ان کے تاریخی پس منظر کے پیشِ نظر بچایا جاسکتا تھا۔

بہرحال ہم حائرِ مقدس کی زیارت کے آٹھ مخصوص مواقع کے متعلق عرض کررہے ہیں۔

(۱) زیارت عاشورا: ان مخصوص ترین ایام میں پہلی محرم سے لیکر ۱۳ رمحرم تک زائرین کا تانتا بندھتا رہتا ہے کیونکہ ان ایام عزا میں زیارت بجالانے کی فضیلت میں ائمہ اطہارؑ سے بہت ساری احادیث سے مروی ہیں۔ مثلاً حضرت امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے:

"جس شخص نے عاشورہ کے دن قبرِ امام حسینؑ کی زیارت بجالائی اور رات قبر کے پاس گذار لی وہ اُس شخص جیسا ہے جو امام عالی مقامؑ کے ساتھ شہید ہوا۔"

یہی سبب ہے کہ اُس دن شہر کربلا میں لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے۔

(۲) زیارت اربعین: یہ کربلا کی اہم ترین زیارتوں میں سے ہے۔ مختلف اسلامی ممالک سے لاکھوں زائرین اس دن زیارت بجالانے کے لئے کربلا میں جمع ہوتے ہیں۔

اس دن بڑے بڑے ماتمی جلوس برآمد ہوتے ہیں۔ ہر جلوس میں پانچ سو سے لے کر ایک ہزار افراد کا مجمع ہوتا ہے۔ ہر شخص برہنہ سر، برہنہ پا، سیاہ لباس میں ملبوس، اشک فشاں اور سینہ کوبی کرتا ہوا ہوتا ہے۔ ہر جلوس کے آگے سیاہ علم ہوتے ہیں جس پر اس دستہ کا نام اور اس مقام کا نام درج ہوتا ہے جہاں کا یہ دستہ ہوتا ہے۔ شیعہ اِس تاریخ کو دو وجہوں سے بڑی اہمیت دیتے ہیں، ایک تو یہ کہ اسی تاریخ کو اہلبیت اطہارؑ زندان شام سے چھوٹکر کربلا پہنچے تھے۔ جہاں جابر بن عبداللہ انصاریؓ اور بنی ہاشم کی ایک جماعت زیارت قبر امام حسینؑ کیلئے پہلے سے آئی ہوئی تھی۔ دوم اس سبب کہ اسی دن امام حسینؑ کا سر واپس ہوا۔ اسی لئے اس دن کی زیارت کو "مَـرَدِّ رَاْس" (واپسی سر) کی زیارت بھی کہتے ہیں۔ اکثر سال اس دن نصف ملین (۵ لاکھ) اور کبھی کبھی پون ملین (ساڑھے سات لاکھ) تک زائرین کی تعداد جا پہنچی ہے جیسا کہ بغداد کے اخبارات نے جلی قلم سے خبریں شائع کی تھیں۔ (اب تو زائرین کی تعداد ساٹھ ستر لاکھ بلکہ ایک کروڑ کے قریب تک پہنچتی ہے۔ (ساجد)

(۳) زیارت یکم رجب: یہ بھی زیاراتِ مخصوصہ میں سے ہے لیکن اس زیارت میں زیادہ تر کربلا اور اس کے مضافات کے زائرین کا مجمع ہوتا ہے۔ اس دن کی زیارت کے متعلق بھی امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ جو شخص یکم رجب کو امام مظلومؑ کی زیارت بجالائے اللہ اُس کے گناہ ضرور بخش دے گا۔ (کامل الزیارت: ص ۱۷۳۔۱۸۲)

(۴) زیارت ۱۵ ررجب: یہ بھی مخصوص زیارتوں میں سے ہے۔ اس روز نزدیک و بعید غرض ہر مقام سے ان گنت زائرین کربلا پہنچتے ہیں کیونکہ ائمہ ہدیٰؑ کی بہت سی احادیث میں ۱۵ ررجب و ۱۵ رشعبان کو زیارتِ کربلا بجالانے کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ محمد بن ابی نصر بزنطیؒ نے حضرت امام رضاؑ سے سوال کیا کہ کس ماہ میں ہم امام عالی مقامؑ کی زیارت کریں۔ امامؑ نے فرمایا ۱۵ ررجب اور ۱۵ رشعبان کو۔ (کامل الزیارت: ص ۱۸۲)

(۵) زیارت ۱۵ر شعبان: بلاشبہ یہ کربلا کی سب سے اہم ترین، مخصوص اور عظیم ترین زیارات میں سے ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ پہلی صدی ہجری ہی سے اس دن زائرین کا بڑا اژدحام ہوا کرتا ہے اور آج بھی وہی کیفیت برقرار ہے۔ اس تاریخ کو زائرین کا اتنا بڑا ہجوم اکٹھا ہوتا ہے کہ جتنا دوسری تاریخوں میں (عاشورا اور اربعین کے ایام چھوڑ کر) بمشکل اکٹھا ہوتا ہوگا۔ دور و نزدیک کے تمام اسلامی ممالک سے زائرین اس تاریخ کو کربلا آجاتے ہیں۔ اُس دن کی زیارت کی فضیلت بھی بہت ہے۔ امامِ جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ جو شخص مسلسل ۳ سال ۱۵ر شعبان کو امام مظلومؑ کی زیارت بجالائے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔ (کامل الزیارت: ص ۱۸۰)

(۶) زیارت شبہائے قدر: ۱۹۔ ۲۱ر اور ۲۳ر ماہِ صیام کی شبوں میں بھی کربلا اور عراق کے دوسرے شہروں میں زائرین کا ایک بڑا جم غفیر اکٹھا ہوتا ہے اور یہاں کی زیارت بجالاکر زائرین نجف اشرف جاتے ہیں۔

(۷) زیارت عیدالفطر: اس دان بھی زائرین کی ایک بہت بڑی تعداد زیارت بجالاتی ہے۔

(۸) زیارت عرفہ وعیدالاضحیٰ: یہ زیارت محرم وصفر کی زیارات کی مقدمہ کہلاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بروزِ عرفہ ان گنت لوگ کربلا آجاتے ہیں خاصکر ایران کے مومنین، تاکہ اس زیارت کے بعد عاشورا اور اربعین کی مخصوص زیارتیں بھی نصیب ہوجائیں۔ یہ تین مہینے یعنی ذی الحجہ، محرم اور صفر زیارت امامِ حسینؑ کے لئے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ عرفہ کے دن کی زیارت کے متعلق بھی ائمہ معصومین علیہم السلام سے متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں۔

باب چہارم

پہلی فصل

روضۂ حسینیؑ اور اُس کی موجودہ بلند و بالا عمارت

یہ حسین و جمیل پُرشکوہ عمارت جو آج قبر امام حسینؑ پر ایستادہ ہے، اس کی شروعات اس عمارت سے ہوئی جو شہادتِ امام حسینؑ کے کچھ ہی روز بعد قبر مطہر پر تعمیر کی گئی۔ شہیدانِ کربلاؑ کے جسد ہائے اطہر کو سپرد خاک کرنے کے بعد لوگوں نے اتنی جگہ پر ایک سائبان بنادیا۔ وہی سائبان امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف رنگ و روپ دھار کر خوب سے خوب تر ہوتا گیا اور آج موجودہ تزک و احتشام، شان و شوکت، اور رفعت و عظمت کا حامل ہے۔ متعدد مرتبہ یہ روضۂ حسینیؑ دشمنانانِ اہلبیتؑ کے ظلم و بربریت اور وحشیانہ پن کا شکار ہوا۔ بنی اُمیہ اور بنی عباس کے ظالم و جابر حکمرانوں نے کئی کئی مرتبہ اسے تاخت و تاراج کر کے زمین بوس کیا اور جو کچھ نقد و جنس، زر و زیور یہاں میں ہاتھ آیا اُنکے کارندے لُوٹکر اپنے گھر لے گئے۔

تاریخِ کربلا پر عصرِ اول سے لیکر آج تک طائرانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت کم و بیش آٹھ مرتبہ انہدام کی شکار ہوئی اور اتنی ہی مرتبہ از سر نو تعمیر کی گئی۔ ایک عمارت جب منہدم ہوئی تو دوبارہ اُس سے بہتر اور خوبصورت عمارت بنی۔ پھر زمین بوس کردی گئی لیکن تیسری مرتبہ زیادہ شان و شوکت سے کھڑی ہوئی۔ بعد ازاں پھر دشمنوں کے ہاتھوں ملیامیٹ ہوئی اور جلد ہی پہلے سے زیادہ دیدہ زیب اور دلفریب عمارت تعمیر ہوگئی۔ اسی طرح بار بار یہ روضۂ حسینیؑ تاراج ہوتا رہا اور پہلے سے زیادہ جاہ و جلال اور حُسن و جمال کے ساتھ تعمیر ہوتا رہا جس کا حال آگے تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا۔

دوسری فصل
واقعۂ کربلا کے بعد روضۂ اطہر کی پہلی تعمیر
پہلی صدی ہجری میں

حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کی قبر شریف پر پہلی عمارت بنی اُمیہ کے دورِ اقتدار میں تعمیر ہوئی۔ اس وقت صرف ایک سائبان اور ایک مسجد بنائی گئی۔ مشرق کی طرف ایک دروازہ رکھا گیا اور دوسرا دروازہ کسی اور طرف تھا۔ صحیح طور یہ پتہ نہیں چلتا کہ سب سے پہلی عمارت کس نے بنائی۔ اس بارے میں جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ سب کچھ قیاس آرائیوں پر مبنی ہے۔ غالب گمان یہی ہے کہ قبیلہ بنی اسد والوں نے چونکہ امام حسینؑ کو دفن کیا تھا لہذا اُنہیں لوگوں نے قبر مطہر پر مسجد تعمیر کی ہوگی۔ (نزہتہ اہل الحرمین: ص ۱۴)

اس بیان کے برعکس صاحبِ ''کنز المصائب'' نے یوں ورطۂ تحریر میں لایا ہے:-

''مختار بن ابی عبیدہ ثقفیؒ نے قبر مطہر پر پہلی عمارت تعمیر کی اور قبر کے قریب ایک گاؤں آباد کیا۔'' (کنز المصائب تاریخ کربلائے معلیٰ: ص ۱۰ مطبوعہ نجف، مجالی اللطف: ص ۳۸)

یہ عمارت بنی اُمیہ کی حکومت کے اختتام تک قائم رہی۔ عمارت کے چاروں طرف پولیس چوکیاں بھی قائم رہیں۔ جن میں چوکس سپاہی زائرین کو قبر اطہر کے پاس آنے سے روکتے تھے۔ یہ عمارت اور مسجد بنی عباسی خلافت کے ابتدائی دور تک باقی تھی اور ہر تباہی و تاراجی سے محفوظ و مامون رہی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ بنی عباس اُس وقت اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے میں مصروف تھے دوم اس باعث کہ عباسیوں کے داعی اور نقیب عام مسلمانوں میں یہی پروپیگنڈہ کرتے پھرتے تھے کہ ہم بنی امیہ کو ہٹا کر یہ حکومت اس کے جائز اور شرعی مستحقین یعنی اہلبیتؑ پیغمبرؐ کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ بنی

عباس کے داعی ونقیب زیادہ تر خراسان کے باشندے تھے اور وہ سب کے سب نہیں تو اُنکی اکثریت علویین کی حامی تھی۔ جب بنی عباس کا اقتدار قائم ہوا اور اُن کی حکومت مستحکم ہوگئی، داخلی شورشوں پر اُنہوں نے قابو پالیا اور بنی اُمیہ کو چن چن کر ختم کردیا تو دھیرے دھیرے اُنہوں نے اولادِ ابی طالبؑ اور شیعان امیر المومنینؑ سے عداوت کا اظہار شروع کیا۔ سفاح کے دور تک یہ عداوت و دشمنی پوشیدہ رہی لیکن منصور کے دور میں کھل کر ایک بھیانک روپ میں سامنے آ گئی۔ اُس نے اولادِ حضرت امام حسنؑ کے اکثر و بیشتر معزّزین اور سرکردہ شخصیات کو صفحہ ہستی سے مٹانے پر کمر کس لی اور جس پر بھی اُس کا بس چلا اُسے تباہ و برباد اور ہلاک کر کے چھوڑا۔ مہدی اور ہادی کے زمانہ میں یہ عداوت پھر کچھ ماند پڑ گئی۔ مگر پھر ہارون رشید کے دور میں پوری شدومد سے ظاہر ہوئی۔ اُس نے کنکر پتھر کے نیچے سے سادات علویین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور پوری طاقت سے اُنہیں کچل ڈالنے کی کوشش کی۔ اُن کے معزّزین و اکابرین کو زندانوں میں ڈال دیا۔ اُن کے سرداروں کو قتل کیا، بزرگوں کی تحقیر و توہین کی۔ زندگی کے آخری دنوں میں اس کے بغض و عناد اور علیؑ و اولادِ علیؑ کی عداوت کا لاوا اس قدر پھوٹ پڑا کہ اُس نے حکم دے دیا کہ کربلا منہدم کردی جائے۔ حضرت امام حسینؑ کی قبر مطہر کا نام و نمود مٹا دیا جائے اور بیر کا وہ درخت بھی کاٹ ڈالا جائے جو قبر اطہر کے پاس اُگا ہوا تھا تاکہ قبر کے تمام آثار و نشانات ایک ایک کر کے مٹ جائیں۔

سید محمد ابن ابی طالب اپنی تاریخ "تسلیۃ المجالس" میں یوں خامہ فرسا ہیں:-

"قبر حسینؑ پر مسجد بھی تعمیر ہوئی تھی۔ یہ مسجد بنی امیہ اور بنی عباس کے دورِ حکومت تک باقی رہی۔ ہارون رشید نے اس مسجد کو منہدم کرا دیا اور بیر کا وہ درخت کٹوا دیا جو قبر حسینؑ کے پاس اُگا ہوا تھا اور قبر حسینؑ زمین کے برابر کر کے اسکے آثار مٹا دئے۔"

(اعیان الشیعہ جلد: ۴۔ ص ۲۰۴، نزہۃ اہل الحرمین: ص ۱۶)

گو کہ کربلائے معلیٰ کی یہ پہلی عمارت ۱۹۳ھ تک باقی رہی جو ہارون رشید کا دورِ اقتدار تھا۔

تیسری فصل

روضۂ اقدس کی دوسری تعمیر

۱۹۳ھ میں بعہد امین و مامون

۱۹۳ھ میں ہارون رشید کے ہاتھوں روضۂ اطہر کی اوّلین تعمیر منہدم کر دینے کے بعد قبر مطہر پر دوسری تعمیر اسی سال عمل میں آئی۔ یہ عمارت چالیس سال یعنی متوکل کے عصر اقتدار تک باقی رہی۔ متوکل علویوں کے بغض و عناد اور روضۂ حسینؑ کے انہدام کے سلسلے میں ہارون رشید پر بھی بازی لے گیا۔ یہ عمارتِ ثانی جو ہارون کے انتقال کے بعد تعمیر ہوئی کے متعلق بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مامون نے بنائی کیونکہ اس کا سلسلہ اُسی دور میں شروع ہوا جس سال اُنہوں نے اہلبیتؑ کی محبت کا دم بھرنا شروع کیا۔ اُس نے اعتراف کیا کہ یہ خلافت علویین کا حق ہے۔ اپنے خراسان کے دوستوں اور ہمدردوں کی خوشنودی کیلئے اُس نے حضرت امام رضاؑ کو اپنا ولیعہد بھی بنا ڈالا۔ عباسیوں کا سیاہ رنگ ترک کر کے علویوں کا سبز رنگ اختیار کیا۔ جس پر شیعوں کی طرف سے عام پسندیدگی کا اظہار کیا جانے لگا اور اُن کو احساس ہوا کہ اس دور میں ہمیں سکون و آزادی کی سانس لینے کا موقعہ فراہم ہوا۔ چنانچہ اس کی زندگی تک اُنہوں نے چین و سکون کے دن بھی گزارے۔

بہر حال یہ صداقت ہے کہ مامون کے دور اقتدار میں قبر اطہر پر روضہ کی از سر نو تعمیر ہوئی اور سرزمین حائر پر ایک بلند و بالا عمارت بنائی گئی جو ۲۳۲ھ تک باقی رہی یعنی متوکل کے تخت نشین ہونے تک۔ متوکل نے مسندِ اقتدار پر قدم رکھتے ہی شیعوں کا قافیۂ حیات تنگ کرنا شروع کیا۔ مملکت اسلامیہ کے گوشہ گوشہ میں اُن کا تعاقب کیا گیا۔ اپنی حکومت

کے پندرہ برس یعنی ۲۳۲ھ سے لیکر ۲۴۷ھ تک اُس نے چار مرتبہ قبر امام حسینؑ کو منہدم کرایا۔ قبر کے آثار مٹادئے، ہل چلوایا اور کھیتی کرنے کی کوشش کی۔ اس نے پہلی تاراجی اپنی تخت نشینی کے پہلے ہی برس یعنی ۲۳۲ھ میں انجام دی جبکہ اس کے گانے والی کنیز ماہ شعبان میں زیارت کربلا معلیٰ کے لئے چلی گئی تھی۔ جبکہ دوسری تاراجی ۲۳۶ھ میں، تیسری ۲۳۷ھ اور چوتھی ۲۴۷ھ میں انجام دی۔ اسی سال متوکل موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ اُسکے بیٹے منتصر کے اشارے پر اُسکے ترک افسرانِ فوج نے اس کا کام تمام کیا۔

متوکل نے اپنے پورے دورِ اقتدار میں کربلائے معلیٰ میں فوجی چوکیاں قائم کیں۔ اُن چوکیوں میں متعین سپاہی زائرین کی گھات میں رہتے۔ جو بھی قبر کے پاس پہنچتا اُسے مار بھگاتے، سخت سے سخت سزائیں دیتے۔ یہاں تک کہ کسی کو قتل کرتے، کسی کو سولی لٹکاتے اور کسی کے ہاتھ پیر تک کاٹ ڈالتے۔

کربلا سے وابستہ جتنے اوقاف تھے متوکل نے اُنہیں بھی ضبط کرلیا اور روضۂ حسینؑ کے خزانوں میں جو کچھ نقد و زر اور مال و اسباب تھا لوٹ کر اپنے سپاہیوں میں تقسیم کردیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ قبر کو اموال و خزائن کی کیا ضرورت؟ (ناسخ التواریخ جلد۲: ص ۳۸ طبع ایران)

متوکل کے اس دورِ استبداد میں شیعانِ امیرالمومنینؑ بھیانک مصائب و مظالم کے شکار رہے۔ اُنہیں سکون کی سانس لینے کا کچھ موقعہ اس کے فرزند منتصر کے دور میں فراہم ہوا، جس نے ترکوں کے ساتھ مل کر ماہ شوال ۲۴۷ ہجری میں اپنے باپ متوکل کا کام تمام کرڈالا۔ تمام مورخین عرب نے متوکل کو عرب کا نیرو قرار دیا ہے۔ منتصر نے محض از راہِ غیرت اور ہمدردئ اہلبیتؑ متوکل کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کیونکہ یہ متوکل، جیسا کہ ابن خلکان اور دوسرے مورخین نے لکھا ہے حضرت علیؑ اور آپکے لخت ہائے جگر حسنؑ و حسینؑ کا شدید دشمن تھا۔ اُس نے چار بار روضۂ حسینؑ کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا۔ آس پاس جتنے

مکان تھے اُنھیں بھی مسمار کرادیا۔ غرض کہ متوکل نے شہرِ کربلا میں عمارات یا کسی چیز کے آثار ونشانات باقی نہ رہنے دیے۔ کربلا کی زمین پر ہل چلوا کر کھیتی باڑی کروانے کی کوشش کی۔ نہر کاٹ کر سرزمین کربلا کو غرق آب کردیا اور سختی سے ممانعت کی کہ کوئی اس جگہ نہ آنے پائے۔ (وفیات الاعیان: ابن خلکان: جلد: ا۔ص ۴۵۵)

اس کے بیٹے منتصر کی قوت برداشت اس وقت جواب دے گئی اور وہ اپنے باپ کا خاتمہ کرنے پر تیار ہو گیا جب اس نے بذات خود اپنے کانوں سے متوکل کو حضرت فاطمہؑ زہرا دختر رسول خداؐ کی شان میں نازیبا اور گستاخانہ کلمات کہتے سن لئے۔ اُس وقت اُس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکی اور صبر وشکیبائی کا دامن ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ اُس نے کسی عالم سے یہ مسئلہ پوچھ لیا۔ عالم نے درجواب کہا کہ متوکل کا قتل کرنا واجب ہے۔ البتہ اپنے باپ کا قاتل دنیا میں زیادہ دن جینے نہیں پاتا۔

منتصر نے کہا جب کہ میں اپنے باپ کو قتل کر کے اطاعت خداوندی بجالاؤں تو مجھے اس کی کوئی پروانہیں کہ میں بھی مرجاؤں۔

(مناقب شہر ابن آشوب جلد: ۲، ص ۱۹۰ مطبوعہ ایران، بحارالانوار وغیرہ)

چوتھی فصل

۲۴۷ھ میں روضۂ حسینیؑ کی تیسری تعمیر

بعہد منتصر باللہ عباسی

روضہ مقدس کی تیسری تعمیر ۲۴۷ھ میں عمل میں آئی جبکہ منتصر اپنے باپ کے قتل کئے جانے کے بعد سریر آرا ہوا۔ مسلمانوں کا حزن وملال اس وقت تک دور نہیں ہوسکتا تھا جب تک متوکل قتل نہ کیا جاتا اور اس کی جگہ منتصر خلیفہ نہ ہوتا۔ یہ منتصر اپنے باپ کے

برعکس انتہائی زاہد و پارسا، پرہیز گار، سخی، فراخدل، پاک سرشت اور امانتدار تھا۔ رعایا کی فلاح و بہبود اور خیر و عافیت کے اسباب بڑھانے کی اُسے بڑی فکر دامنگیر رہا کرتی۔ اس نے خلیفہ ہوتے ہی از سرنو امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ اور امام حسینؑ کے روضے تعمیر کرائے۔ اہلبیتؑ کے ان اوقاف کو واگذار کر دیا جو متوکل نے ضبط کر لیے تھے۔ اسی طرح اس نے ذمی کفار سے تعرّض کرنے کی بھی عام ممانعت کر دی تھی، لیکن بدنصیبی سے وہ جلد ہی مر گیا اور اس کی حکومت چھ ماہ سے زیادہ نہ رہ سکی۔ (تاریخ العرب: سید امیر علی: ص: ۲۴۸۔۲۴۹)

اس چھ ماہ کے مختصر وقفے میں اس نے اپنے باپ کی غلطیوں کی تلافی کی از حد کوشش کی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس نے اہلبیتؑ اور شیعانِ اہلبیتؑ کی بڑی خدمات انجام دیں۔ کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف پر بھرپور توجہ مرکوز کی۔ دیگر ائمہ طاہرینؑ اور اولادِ ابی طالبؑ کی قبروں سے کسی قسم کا تعرّض نہیں کیا۔ چنانچہ علامہ مسعودی رقمطراز ہیں:۔

''منتصر کی خلافت سے پہلے آلِ ابی طالبؑ سخت ترین مصائب و آلام میں گرفتار تھے۔ سبھوں کو اپنی جانوں کا خطرہ لاحق تھا۔ ان لوگوں کو حضرت امام حسینؑ اور حضرت علیؑ کی قبر کی زیارت سے روک دیا گیا تھا۔ اسی طرح دیگر شیعوں پر بھی ان مشاہد مقدسہ پر آنے کی سختی سے ممانعت تھی۔ ۲۳۶ھ میں متوکل نے اپنے ایک ملازم کو جو ذی رتح کے نام سے مشہور تھا، حکم دیا کہ کربلا جا کر امام حسینؑ کی قبر کا نام و نمود مٹا دے اور جس شخص کو وہاں پائے سزا دے۔''

اس کے بعد مسعودی آگے رقمطراز ہیں:۔

''یہی صورت حال منتصر کے تخت نشین ہونے تک جاری رہی۔ منتصر کے خلیفہ ہونے پر لوگوں کو امن و سکون نصیب ہوا۔ اُس نے آل ابی طالبؑ پر ظلم و استبداد کا سلسلہ بند کیا اور حکم جاری کیا کہ کسی کو نہ قبر حسینؑ کی زیارت سے روکا جائے اور نہ دیگر آل ابی طالبؑ کی قبروں کی زیارت سے۔ اس نے حکم دیا کہ اولاد حسنؑ و حسینؑ کو فدک واپس کر دیا

جائے۔اس نے آل ابو طالبؑ کے سبھی اوقاف واگذار کروادیے۔ شیعوں سے تعرض کرنے اور ان کو اذیتیں پہنچانے کا دستور ختم کردیا۔(مروج الذہب برحاشیہ تاریخ کامل)

(مروّج الذہب میں ذی ربیع نام درج ہے مگر صحیح نام دیزج ہے جیسا کہ دیگر کتابوں میں مذکور ہے۔)

چونکہ منتصر علویوں اور اولاد ابی طالبؑ پر بہت مہربان تھا، اس نے اپنے دور حکومت میں بہت احسانات کیئے۔ ان میں کافی مال ودولت تقسیم کی اور قبور اہلبیتؑ کی سابقہ حشمت اور رونق بحال کردی۔اس نے روضہ حسینیؑ کو از سر نو بنوایا۔زیارت قبر حسینؑ کیلیئے لوگوں کی ہمت افزائی کی۔(نزہتہ اہل الحرمین جلد:۲۔ص۱۷،اعیان الشیعہ جلد:۴:ص۳۵)

بہرکیف روضۂ امام عالی مقامؑ کی تیسری تعمیر منتصر کے حکم سے ۲۴۷ھ میں ہوئی۔

پانچویں فصل

۲۸۳ھ میں روضۂ حسینیؑ کی چوتھی تعمیر

بدست داعی صغیر محمد بن زید بن الحسن الحسینی بادشاہ طبرستان

۲۸۳ھ کے قریب حائر مقدس کی چوتھی تعمیر روبعمل میں آئی کیونکہ منتصر کے دور میں جو عمارت ۲۴۷ھ تا ۲۴۸ھ میں تعمیر ہوئی تھی وہ ماہ ذی الحجہ ۲۷۳ھ میں اچانک گر پڑی۔روضۂ مقدس کی چھت بھی زمین بوس ہوگئی۔ بہت سے زائرین دب کر مر گئے اور بہت سے بال بال بچ نکلے۔ بظاہر یہ سانحہ اس وقت پیش آیا جبکہ حرم حسینیؑ میں عرفہ کے موقعے پر جو ائمہ معصومینؑ کے ارشادات کے مطابق زیارت کربلا کا مخصوص دن ہے زائرین کا ایک بہت بڑا اژدہام جمع ہوگیا تھا۔اس طرح یہ حادثہ ۹ رو ۱۰ ر ذی الحجہ ۲۷۳ھ کو

پیش آیا۔ کیونکہ اِن دودنوں کے دوران وہاں زائرین کی زبردست بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ناگہانی سانحہ وہ بھی اتنے اہم ترین روز اپنے آپ وقوع پذیر ہوا یا یہ کسی سیاست گری کا شاخسانہ تھا؟ عمارت کی بنیادیں کچھ کمزور تھیں کہ اس وجہ سے خود بخود زمین بوس ہوئی یا حکومتِ وقت کی کوئی منظم سازش اس میں کارفرما تھی۔ اگر یہ سازش تھی تو یقیناً منصور، ہارون اور متوکل کے اقدامات سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔ ان ظالموں نے تو کھلم کھلا زائرین کی نظروں کے سامنے روضہ منہدم کرایا جسکی وجہ سے اُنہیں اپنی جانیں بچانے کا موقعہ میسر ہوا ہوگا۔ جبکہ انہدام روضۂ حسینیؑ کی یہ منظم سازش ایسے وقت کی گئی جب اس میں زائرین کا تانتا بندھا ہوا تھا، کہیں تل دھرنے کی جگہ میسر نہ تھی اور اس طرح یہ سازش روبعمل لائی گئی کہ دفعتاً عمارت گر پڑنے کی وجہ سے ان گنت افراد دب کر مر گئے۔ سیاست کی شعبدہ گری اور نت نئی چالبازیوں کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات کوئی تعجب خیز بھی نہیں ۲۷۳ھ میں اس حادثے کے بعد بظاہر روضہ حسینیؑ دس سال تک یوں ہی چھت کے بغیر رہا۔ یہاں تک کہ ۲۸۳ھ میں محمد بن زید بن الحسن بن محمد بن اسماعیل ملقب بہ داعی صغیر کے ہاتھوں اس کی از سر نو تعمیر ہوئی۔ یہ محمد داعی صغیر اپنے بھائی حسن ملقب بہ داعی کبیر کے بعد طبرستان کے باشاہ ہوئے۔ دس برس تک ان کی حکومت رہی۔ انہوں نے ہی معتضد عباسی کے دور خلافت میں نجف اشرف اور روضہ حسینیؑ کی تعمیر و تجدید کی۔

محمد بن ابی طالب اپنی کتاب "تسلیۃ المجالس" میں کربلا و نجف کے عتبات مقدسہ کی مختصر کے عہد میں ہوئی تعمیر جدید کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں خامہ فرسا ہیں:۔

"یہاں تک کہ حسن اور محمد فرزندان زید بن حسن نے خروج کیا اور محمد نے روضہ نجف اور روضہ حسینیؑ کی تعمیر کا حکم دیا اور دونوں قبروں پر عمارتیں بنوائیں۔ (اعیان الشیعہ جلد:۳ ص ۳۰۶، نزہتہ الحرمین ص ۲۰، فرحۃ الغریٰ ابن طاؤس و تاریخ کربلائے معلیٰ ص:۱۴)

حسن بن زید جو داعی کبیر یعنی دین اسلام کی طرف دعوت دینے والا کے لقب سے مشہور تھا تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں اس قدر قوت کا حامل ہو گیا کہ اس نے طبرستان کو عباسی خلافت سے الگ کر دیا، وہاں کے باشندوں میں دین اسلام کی نشر و اشاعت شروع کی اور ایک مطلق العنان فرمانروا کے طور پر ابھر گئے۔ (تاریخ العرب سید امیر علی: ص ۲۵۱)

اس کے بعد اس کا بھائی محمد، جس کا لقب داعی صغیر تھا مسند خلافت پر براجمان ہوا، انہوں نے بیس سال تک حکومت کی۔ انہوں نے معتضد عباسی سے بھی اپنے خوشگوار تعلقات استوار کئے تھے۔ وہ ۲۷۸ھ سے ۲۹۹ھ تک سریر آرائے خلافت رہا۔ معتضد کو اعتماد میں لیکر انہوں نے کربلا و نجف کے عتبات عالیات کی تعمیر نو کی۔ وہ پہلے کربلا کی زیارت کو آئے، پھر نجف اشرف گئے۔ انہوں نے ان دونوں روضوں کی مضبوط عمارت بنانے کیلئے بلادِ عجم سے بہت سا نقد و زر اور مال و اسباب بھیجا۔ حائر مقدس پر بلند و بالا قبہ بنوایا جس میں دو دروازے تھے۔ پھر حائر کے ارد گرد چار دیواری کھڑی کی اور بہت سے مکانات تعمیر کرائے اور حتی الامکان کربلا کے باشندوں اور مجاوروں پر لطف و عنایات کی بارش کی۔ محمد بن زید کی انتہائی کوشش رہی کہ عمارت جہاں تک ہو سکے پُر شکوہ، حسین و جمیل اور نقش و نگار میں لاثانی ہو۔ (مجالی اللطف شیخ محمد سماوی: ص ۳۹، ۴۰)

ان دونوں بھائیوں کے مفصل حالات "مدینۃ المعاجز" اور "تحفۃ العالم" کتابوں میں کچھ اس طرح بیان ہوئے ہیں:-

"محمد بن زید بن محمد ابن اسماعیل ابن الحسن ابن زید ابن الحسن المجتبیٰ[ع] المعروف بہ داعی صغیر ۲۷۳ھ میں طبرستان کے بادشاہ ہوئے۔ اُن سے پہلے اُن کے بھائی حسن بن زید ملقب بہ داعی کبیر طبرستان کے بادشاہ تھے۔ وہ ۲۵۰ھ میں طبرستان میں مسند اقتدار پر براجمان ہوا اور ۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ ان کی تصنیفات میں کتاب "الجامع"، کتاب

''البیان'' اور ''کتاب الجنۃ'' ہے۔ یہ لاولد مرے۔ ان کے بعد ان کے بھانجی داماد ابوالحسین احمد بن محمد بن ابراہیم بن علی عبدالرحمٰن شجری بن قاسم بن الحسن بن زید بن الحسنؑ باشاہ ہوئے۔ داعی کبیر کے بھائی محمد بن زید اس وقت جرجان میں تھے انہیں جب بھائی کے مرنے اور ابوالحسین کے بادشاہ بن بیٹھنے کی اطلاع ملی تو لشکر لے کر ابوالحسین پر چڑھ دوڑے اور ۲۷۱ھ میں اسے قتل کر ڈالا اور خود طبرستان کے بادشاہ ہوئے۔ سترہ برس ساتھ مہینے حکومت کی۔ آس پاس کے تمام علاقوں کو زیر نگین لایا۔ رافع بن ہرثمہ نے نیشاپور میں ان کے نام کا خطبہ بھی پڑھنا شروع کر دیا۔ بعد میں یہ خراسان کی تسخیر کیلئے لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ جرجان کے باہر جنگ ہوئی اور قتل ہو گئے۔

چھٹی فصل

روضہ حسینیؑ کی پانچویں تعمیر

۳۶۹ھ میں بعہد سلطان عضد الدولہ بویہی

۳۶۹ھ میں عضد الدولہ فنا خسرو بن رکن الدولہ بویہ دیلمی کے ہاتھوں حائر مقدس کی چھٹی تعمیر عمل میں آئی جو اپنے باپ کے بعد خلیفہ طائع بن مطیع عباسی کے دور خلافت میں بغداد کا والی بنا۔ عضد الدولہ محض پانچ برس تک برسر اقتدار رہا۔ ۳۷۲ھ میں وہ اس دارفانی سے کوچ کر گیا۔ عضد الدولہ نے کربلا و نجف کی زیارت کی اور ان دونوں مشاہد مقدسہ کی تعظیم و تکریم میں حد سے زیادہ اہتمام کیا۔ دونوں روضوں کی عمارتیں از سر نو تعمیر کرائیں، ان کیلئے جائیدادیں وقف کیں۔ عضد الدولہ ہر سال کربلا و نجف کی زیارت کو جاتا۔ خاندان آل بویہ کی عہد حکومت میں کربلا کو بے حد عروج حاصل ہوا۔ اس کی دینی،

اجتماعی، سیاسی و معاشی شان و شوکت دوبالا ہوگئی۔ تجارت میں از حد اضافہ ہوا، زراعت کو غیر معمولی فروغ ہوا۔ علوم وفنون میں چار چاند لگے۔ بڑے بڑے جیّد علماء اور نامور شعراء یہاں پیدا ہوئے اور اس کی علمی و دینی مرکزیت تمام دوسرے مقامات پر سبقت لے گئی۔

علامہ ابن اثیر نے اپنی ''تاریخ کامل'' میں سلطان عضد الدولہ کے کارناموں، نیز اُس کی خدمامت کو جو اس نے مکہ و مدینہ اور کربلا و نجف کے سلسلے میں انجام دیے، جی کھول کر سراہا ہے۔ اُس نے جو علمی و اسلامی خدمات انجام دی ہیں وہ لائقِ صد تحسین ہیں۔ اس نے روضہ حسینیؑ کی تعمیر و ترقی میں غیر معمولی دلچسپی دکھادی۔ قبہ کو از سرِ نو بنوایا۔ قبہ کے اردگرد رواقوں کو پہلے سے زیادہ تزک و احتشام بخشا، زیبائش و آرائش میں انتہا کردی۔ ضریح اقدس کی رونق و دلکشی بڑھانے میں پانی کی طرح پیسے خرچ کیے۔ سرزمین حائر کے گرد و نواح میں مکانات اور بازار بنوائے۔ شہر کربلا کے چہار جوانب بلند و بالا شہر پناہ کی فصیل تعمیر کرائی اور اس کو ایک مضبوط قلعہ کی شکل دے دی۔ پھر شہر کے باشندوں کے لئے پانی اور روشنی کی فراہمی کا اہتمام کیا۔ دور دراز سے نہریں کاٹ کر کربلا تک لائی گئیں۔ اسی طرح روشنی کے لئے بھی مخصوص انتظام کیے۔ (مجالی اللّطف ص:۴۰)

گو کہ سلطان عضد الدولہ کو اہلبیت اطہارؑ سے جو بے پناہ عقیدت و مؤدت تھی اس کی بدولت اُس نے کربلا کی تعمیر و ترقی اور شان و شوکت میں نئی روح پھونک دی۔ جبکہ عباسی سلاطین کی ظالمانہ روش اور تخریب و تباہ کاری کے نت نئے ہتھکنڈوں کے باعث اسی شہر کربلا کی رونق دم توڑنے کے قریب تھی۔

شیخ بہاء الدین عاملیؒ نے بھی اپنی کتاب ''معرفة شهور السّنة'' میں سلطان عضد الدولہ کے ہاتھوں کربلا و نجف کے روضوں کی تعمیر و مرمت کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ماہ شوال ۳۷۲ھ کے حالات کے ضمن میں وہ رقمطراز ہیں:-

''۸/شوال کو سلطان فاضل عضد الدولہ دیلمی نے ۳۷۲ھ میں وفات پائی۔ یہ راسخ العقیدہ اور سخت گیر شیعہ تھے۔ ان کی تعمیر کردہ عمارات میں قبۂ امیرالمومنینؑ اور قبہ حسینیؑ شامل ہے۔'' (تظلم الزہرا: ص:۲۲۲: طبع ایران)

سلطان عضد الدولہ کی کربلا و نجف کی ایک سفرِ زیارت کی سرگذشت ''فرحتہ الغریٰ'' اور ''تحفتہ العالم'' میں ان الفاظ میں مرقوم ہے:۔

''ماہ جمادی الاوّل ۳۷۱ھ میں عضد الدولہ نے روضۂ حسینیؑ اور روضہ نجف کی زیارت کی۔ جمادی الاوّل کی آخری ایام میں روضۂ حسینیؑ پر حاضری دی۔ بہت نقد و زر خیرات کیا۔ ہر طبقے کے لوگوں پر لطف و عنایات کی بارش کی۔ صندوق بھر درہم سادات علویین میں تقسیم کیے۔ ہر ایک کے حصے میں بتیس درہم آئے۔ اس وقت وہاں تیس سو کی تعداد میں سادات علوی رہتے تھے۔ عوام اور مجاورین کو دس ہزار درہم دیے۔ کربلا کے باشندوں میں ایک لاکھ پونڈ ستو اور خرمے تقسیم کیے۔ پانچ سو کپڑے بانٹے اور روضے کے نگراں کو ایک ہزار درہم دیے۔ پھر وہاں سے نجف اشرف پہنچا اور مرقد امیرالمومنینؑ کی زیارت کی سعادت حاصل کر لی۔ صندوق بھر درہم یہاں بھی تقسیم کیے۔ سترہ سو علویین وہاں موجود تھے۔ ہر ایک نے اکیس درہم پائے۔ مجاورین وغیرہ میں پندرہ سو درہم بانٹے۔ نجف اشرف کی زیارت کو آنے والوں میں پندرہ سو درہم تقسیم کیے۔ اطراف و اکناف کے لوگوں میں ایک ہزار درہم فقراء اور فقہا کو تین ہزار درہم دیے''۔ (فرحتہ الغریٰ ص:۵۹، تحفتہ العالم: جلد:۱، ص۲۷۳)

اسی سلطان عضد الدولہ کے دورِ حکومت میں کربلا معلیٰ کی سرزمین پر عمران بن شاہین نے مسجد اور وہ رواق تعمیر کیا جو رواق عمران کے نام سے مشہور ہے۔

عمران بن شاہین سے کوئی بہت بڑی خطا سرزد ہوئی تھی اور حکومت کے ڈر سے وہ جنوبی علاقوں کی طرف فرار ہوا اور رفتہ رفتہ وہاں زور پکڑتا گیا اور وہاں اپنی ایک مستقل

اور خودمختار حکومت کی داغ بیل ڈالی، جو اس کے انتقال کے بعد بھی باقی رہی اور اس کی اولاد یکے بعد دیگرے مسند اقتدار پر براجمان ہوتی رہی۔ سلطان عضدالدولہ کے دور میں اس نے نافرمانی کی۔ پھر فرار ہو کر حضرت علیؑ کے حرم میں پناہ لی اور عضدالدولہ نے اسے معاف کر دیا اور اسی عمران نے کربلا و نجف میں وہ رواق تعمیر کیا جو رواق عمران کے نام سے مشہور ہے۔ (فرحۃ الغریٰ: ابن طاؤس، ص: ۶۷) یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے خدا سے نذر کی تھی کہ اگر عضدالدولہ کے غیظ و غضب سے جان بچ گئی تو کربلا، نجف اور کاظمین تینوں مقامات پر مساجد تعمیر کروں گا۔ چنانچہ امان ملنے پر اس نے تینوں شہروں میں مسجدیں تعمیر کرائیں۔ نجف کی مسجد روضۂ اطہر کے رواق سے ملحق تھی، پھر سلطان شاہ عباس صفوی نے صحن بنوا کر مسجد اور رواق کو الگ الگ کر دیا۔ اس مسجد کے دو دروازے ہیں۔ ایک باب طوسی کے پاس، دوسرا صحن میں جس کے آثار اب معدوم ہو چکے ہیں۔ یہ مسجد آج بھی مسجد عمران کے نام سے مشہور ہے۔

(آثار الشیعۃ الامامیہ: عبدالعزیز جواہری ص: ۱۲۷: طبع تہران)

حائر مقدس میں بادشاہوں کے مقبرے

سلاطین آل بویہ نے اہلبیت اطہارؑ کی جو شاندار خدمات سرانجام دیں اُن سے نہ کوئی منکر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ قابل فراموش ہیں۔ تاریخ اس کا سب سے روشن ثبوت ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بھی بے انتہا عقیدت و خلوص سے عتبات عالیات کی خدمات سرانجام دیں اور اس جہان فانی سے کوچ کرنے کے بعد ان ہی مشاہد مقدسہ کو اپنی آخری آرام گاہ بنایا۔ کچھ کو سرزمین نجف مرغوب ہوئی اور کچھ کو ارضِ حائر حسینیؑ کی مودت اپنی آغوش میں سمو گئی۔ حائر حسینیؑ میں ان کی قبریں روضۂ امام حسینؑ کے مشرقی حصہ میں

واقع ہیں۔ یہ جگہ آج کل صحن صغیر کے نام سے جانی جاتی ہے۔ صحن حسینیؑ سے فرق کرنے کیلئے یہ صحن صغیرہ وہ صحن ہے جو بہت قدیمی چہار دیواری سے محصور ہے اور اس کی دیواریں کاشانی نقش ونگاری سے آراستہ وپیراستہ ہیں۔ چھتوں میں بھی انتہائی حسین وجمیل نقش ونگاری کی ہوئی ہے۔

سلاطین آل بویہ نے حائر مقدس میں اسلئے اس مقام کو اپنی قبروں کے لئے منتخب کیا تا کہ ان کی قبریں دونوں حرم مقدسات کے راستہ میں پڑیں اور زائرین ان پر سے چل کر ایک حرم سے دوسرے حرم تک جائیں۔ انہوں نے اس عمارت کو بڑی خوبصورتی اور نفاست سے تعمیر کیا۔ یہ پوری عمارت فنکاری اور صنعگری کے لحاظ سے شاہکارانہ حیثیت کی حامل ہے اور چوتھی یا پانچویں صدی ہجری میں جبکہ عباسیوں کی خلافت تھی، یہ اس وقت کی قدیمی اور تاریخی عمارتوں میں سے ہے۔ اُن میں سے بعض سلاطین واُمرأ کی قبریں صحن کے بیچوں بیچ ہیں اور بعض صدر دروازہ کے پہلو میں۔ یہ صدر دروازہ شمال کی جانب ہے۔ سلاطین آل بویہ نے جو اپنے دور میں غیر معمولی جاہ وجلال اور غلبہ واقتدار کے مالک تھے جن کی دولت وثروت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا، انہوں نے اپنے مقابر کے لئے یا حرم حسینیؑ کے لئے جائیدادیں وقف کی تھیں یا نہیں اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے، اگر رکھی تھیں تو اِن اوقاف کا کیا ہوا۔ عین ممکن ہے کہ سلاطین ترکیہ کے بادشاہ مراد چہارم نے ۱۶۳۸ء میں فتحِ عراق کے موقعے پر جہاں شیعوں کی دوسری جائیدادیں اور اموال و اسباب لوٹے وہاں ان اوقاف کا بھی خاتمہ کردیا ہو۔ مشہور انگریزی مورخ لونکریک اپنی کتاب ''تاریخ عراق کے چار سو سال'' کے صفحات ۷۹ و ۸۰ میں یوں رقمطراز ہے:۔

''سلطان مراد چہارم نے مفتی یحییٰ کو حکم دیا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی کا روضہ پھر سے تعمیر کرے، اس کے لئے بے شمار اوقاف وقف کیئے گئے۔ ان کا بیشتر حصہ

شیعوں سے ہڑپ کردہ جائیدادوں پر مشتمل تھا"۔
عین ممکن ہے کہ خان پاشا کبیر جو کربلا کے نزدیک ہے، اسی طرح تکیہ خالد یہ جونجف کے بازار میں واقع ہے ان مشاہدِ مشرفہ کی جائیدادوں ہی میں سے ہوں جنہیں مراد چہارم نے ہڑپ کرلیا تھا۔ ورنہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور حضرت خالد بن ولید کیلئے کربلا و نجف میں اوقاف ہونا بعید از قیاس ہے۔
بہر حال سلاطین کے یہ مقابر اور صحن صغیر جو حائر حسینیؑ سے متصل تھے ۱۳۵۴ھ تک باقی رہے۔ آج کل ان کے آثار و نشانات بھی نمودار نہیں۔ اب صرف آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے دلوں میں ہی اُن کی یاد باقی رہ گئی ہے۔ کتنی حسرت اور افسوس کا مقام ہے کہ دوسرے ممالک میں تو آثار قدیمہ کی حفاظت کے لئے بڑا اہتمام کیا جاتا ہے، معمولی معمولی چیز بھی بہت سنبھال کر رکھی جاتی ہے مگر کربلائے معلیٰ میں انتہائی قدیم عمارتیں جو عباسی دورِ خلافت کی یادگار تھیں بلا سوچے سمجھے اور بلا جھجک مٹائی جا رہی ہیں۔
کربلا کے ڈپٹی کمشنر عبدالرسول خالصی کو محرم الحرام سے چند روز قبل حکم ملا اور ٹھیک زیارات کے ایام کے دوران ۲۲ / محرم ۱۳۶۸ھ مطابق ۲۴ / نومبر ۱۹۴۸ء کو انہوں نے صحن صغیر کھودنے پر مزدور مامور کردیے اور ڈائنامنٹ وغیرہ کے ذریعے محض دو تین دن کے اندر اندر ہی وہ ساری عمارتیں زمین بوس کردیں گئیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے اس انہدامی کاروائی کے لئے حکومت کی پوری مشینری کام پر لگادی تھی۔ چپہ چپہ پر پولیس اور فوج تعینات تھا۔ ہر سمت سے دروازے بند کردیے گئے تھے۔ کسی کو قریب جانے کی اجازت نہیں تھی اور بہانہ یہ تراشا گیا تھا کہ سڑکیں کشادہ کی جارہی ہیں۔ حالانکہ یہی کام ان مقابر اور صحن صغیر کو چھوڑ کر بھی بہت آسانی سے ہوسکتا تھا۔

❁❁❁

ساتویں فصل

سنہ ۴۰۷ھ میں روضۂ حسینیؑ کی چھٹی تعمیر

بتوسط وزیر ابن سہلان رامہرمزی

روضۂ حسینیؑ کی چھٹی تعمیر پانچویں صدی ہجری کے ابتدا میں ہوئی۔ کیونکہ سلطان عضدالدولہ بن رکن الدولہ نے سنہ ۳۷۹ھ سنہ ۳۸۰ھ میں جو شاندار روضہ تعمیر کرایا تھا۔ شومیٔ تقدیر سے وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ یہ عمارت ایک ناگہانی حادثے میں دفعتاً راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی۔ وہ ایسے کہ ماہ ربیع الاول سنہ ۴۰۷ھ میں کسی رات اچانک روضے میں آگ نمودار ہوگئی جسکی وجہ سے سب کچھ نذر آتش ہوگیا۔ یہاں تک کہ بلند و بالا گنبد اور رواق بھی اس بچ نہ سکے۔ صرف حرم کا تھوڑا بہت حصہ اور باہر کی شہر پناہ کی فصیلیں بچ پائیں۔

علامہ ابوالفرج ابن جوزی جو اس واردات کے قریب ترین مورخ گذرے ہیں نے اپنی کتاب ''المنتظم فی تاریخ الملوک والامم'' میں اس سانحے اور اس کے ظاہری اسباب پر ڈیڑھ سو برس بعد کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے:۔

''سنہ ۴۰۷ھ کے ماہ ربیع الاول میں مشہدِ حسینیؑ اور تمام اوراق نذر آتش ہوگئے اس کی وجہ یہ ہوئی کہ خدام نے دو بڑی شمعیں روشن کی تھیں۔ آدھی رات کو یہ دونوں شمعیں گر پڑیں جس سے آگ ہر طرف پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ خاکستر ہوگیا۔''

(المنتظم فی تاریخ الملوک والامم: جلد ۷: ص ۲۸۲: طبع حیدرآباد دکن: سنہ ۱۳۸۵ھ)

علامہ ابن اثیر نے بھی سنہ ۴۰۷ھ کے واقعات کے ذیل میں اس ہولناک آتشزدگی کی واردات کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:۔

''اسی ماہ ربیع الاول میں قبۂ مشہد الحسینؑ اور رواق سب کے سب نذر آتش ہوگئے۔

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ خدّام نے دو بڑی شمعیں روشن کی تھیں جو رات میں گر پڑیں
جس سے حرم میں آگ لگ گئی اور یہ آگ پوری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے گیا"۔

(البدایہ والنہایہ ابن کثیر: جلد ۱۲ :ص:۴-۵، تاریخ کامل: جلد ۹: ص:۱۰۲)

اندازاً آگ کی یہ ہولناک واردات ربیع الاول کے پہلے عشرہ کے آخر یا دوسرے عشرہ کے ابتدا میں رونما ہوئی اور شاید خود بخود نہیں ہوئی بلکہ اس کے پس پردہ خفیہ ہاتھ کارفرما تھے۔ قادر باللہ عباسی کو جو اس وقت خلیفہ تھا کے دورِ حکومت میں جس طرح تمام مملکت اسلامیہ کے طول وعرض میں حادثات، شرانگیزیاں اور فتنے بپا تھے کی وجہ سے حکومتِ وقت کو بے تعلق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جیسا کہ آگے چل کر صراحت کے ساتھ بیان ہوگا۔

جب قادر باللہ کی سازشی کاروائیوں کی وجہ سے ہر سو امن عامہ بگڑ گیا تو عباسی وزارت عظمیٰ کا عہدہ ایک منجھے ہوئے سیاستدان، ماہر و تجربہ کار مدبر کے حوالے کرنے پر مجبور ہوئے تا کہ پوری مملکت میں جو شورش برپا ہے اس کا ازالہ ممکن ہو، امن عامہ برقرار ہو سکے اور سکون و چین کی فضا پھر استوار ہو۔ چنانچہ ربیع الاول ختم ہوتے ہی اگلے ماہ ابن سہلان رام ہرمزی وزیر اعظم نامزد ہوا۔ ابنِ جوزی "المنتظم" میں رقمطراز ہیں:-

"ماہ ربیع الثانی میں ابو محمد حسن بن فضل رام ہرمزی کو خلیفۂ وقت کی جانب سے خلعتِ وزارت عطا ہوئی اور اس نے حائر حسینیؑ کی چار دیواری تعمیر کی"۔

ابن سہلان نے سب سے اوّلین کام تو یہی انجام دیا کہ حائر حسینیؑ کی فصیل پھر سے تعمیر کروائی جو منفی اور سفاکانہ سیاست کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ جیسا کہ ابن جوزی نے 'المنتظم' اور ابن کثیر شامی نے "البدایہ والنہایہ جلد ۱۲۔ص:۱۶" پر صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ وہی حصار ہے جس کا علامہ ابن ادریسؒ نے اپنی کتاب "السرائر" میں ذکر کیا ہے۔

بہر حال ابن سہلان نے اس باہری فصیل کو پھر سے تعمیر کیا اور پہلے سے بھی زیادہ

حسین و جمیل روضے کی عمارت بنوائی۔ ابن بطوطہ نے جب ۷۲۷ھ کی کربلا معلیٰ کی سیاحت کی تو اُس نے اسی عمارت کو دیکھا تھا اور اپنے سفرنامہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے روضہ کی تعمیر کے علاوہ ابن سہلان نے نجف اشرف کے صحن کی چار دیواری بھی تعمیر کروائی جو اُس نے حائر حسینیؑ کی چار دیواری سے سات برس قبل بنائی تھی۔ علامہ ابن اثیر ۴۰۰ھ کے واقعات کے ذیل میں خامہ فرسا ہے:-

''اسی ۴۰۰ھ میں ابو محمد بن سہلان بیمار پڑا اور مرض اتنی شدت اختیار کر گئی کہ اس نے منت مانگی کہ اگر میں شفا پاؤں تو حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے روضے کے ارد گرد دیوار تعمیر کروں گا چنانچہ اُسے شفا ہوئی اور اُسی نے چار دیواری بنانے کا حکم دیا۔ اسی ۴۰۰ھ میں ابو اسحاق ارجانی کی نگرانی میں چار دیواری بن کر تیار ہوگئی''۔

یہ کیفیت و عقیدت اس زمانہ میں تھی۔ آج کل تو یہ حال ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ جیسا کہ بظاہر اندازہ ہوتا ہے منت مانگتے ہوں گے کہ اگر حکومت کی بھاگ ڈور ہاتھ میں آئی تو حائر حسینیؑ اور اسکے ارد گرد جتنی عمارتیں ہیں سب کو کھود ڈالیں گے۔

بدقسمتی سے ابن سہلان زیادہ دیر جی نہ سکا بلکہ ۴۲۴ھ میں مارا گیا۔ اس کی بنوائی ہوئی عمارت جو روضہ مطہر کی چھٹی تعمیر تھی دو سو تیرہ سال یعنی ۶۲۰ھ تک باقی رہی اور اس مدت کے دوران روضہ مطہر کے حوالے سے کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہوا، البتہ ۵۲۶ھ میں خلیفہ مسترشد باللہ العباسی نے کچھ دست درازیاں کیں۔ اس کے دور میں دہشتگردی کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا اور شیعوں کا قافیۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ حائر مقدس کے خزانے بیش بہا مال، و اسباب اور زر و جواہرات سے چھلک رہے تھے جو بطور نذر یا بطور وقف خزانہ حسینیؑ کی ملکیت تھے۔ مسترشد نے چھاپہ مارا اور جو کچھ یہاں نقد و زر، مال و اسباب ہاتھ لگا سب ہڑپ کر لیا جیسا کہ اُس سے قبل متوکل کر چکا تھا۔ اُس نے یہ کہہ کر خزانے کی ساری

دولت وثروت اپنی لشکر میں تقسیم کردی کہ قبر کو خزائن اور مال واسباب کی کیا ضرورت۔

مسترشد نے بس اسی لوٹ پر اکتفا کیا۔ حائر حسینیؑ یا قبر مطہر کے ساتھ کوئی گستاخی نہیں کی اور اس اعتبار سے اس کا رویہ دوسرے عباسی خلفاء کے برعکس کچھ بہتر ہی رہا۔

(بحار الانوار۔ جلد: ۱۰، ص ۲۹۷ تظلم الزہرا: ص ۲۱۹ تاریخ کربلائے معلیٰ: ص: ۱۳۰)

آٹھویں فصل

روضہ حسینیؑ کی ساتویں تعمیر

۶۲۰ھ میں بعہد ناصر الدین اللہ العباسی

بظاہر حائر مقدس میں پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے درمیان کوئی ایسا سانحہ پیش نہیں آیا جس کے پیش نظر مشہدِ حسینؑ کی از سر نو تعمیر یا تجدید و مرمت کی نوبت لاحق ہوئی۔ اس طویل دور میں صرف مسترشد باللہ عباسی کا مذکورہ بالا سانحہ رونما ہوا تھا کہ اس نے حرم حسینیؑ کی ساری دولت اور خزانوں کا سارا نقد و زر اور جواہرت ۵۲۶ھ میں لوٹ لئے۔ جیسا کہ اوپر صراحت ہو چکی ہے۔ ابن سہلان کی تعمیر کردہ عمارت جو ۴۰۷ھ میں تاسیس ہوئی تھی ابوالعباس احمد الناصر الدین اللہ (۵۷۵ھ تا ۶۲۲ھ) کے دور تک قائم رہی۔

تاریخ گواہ ہے کہ ناصر الدین اللہ بڑا صاحبِ کرّ و فر خلیفہ گذرا ہے اس کا سنتالیس سالہ طویل دورِ سلطنت خوش حالی، فارغ البالی اور عسکری لحاظ سے بڑا شاندار زمانہ تھا۔ اس نے بہت بڑی لشکر بنا رکھی تھی جس کی وجہ سے آس پاس کی تمام ریاستوں پر اس کی دھاک جمی رہی۔ اس کے دور میں پورے مملکت اسلامیہ میں امن وامان کا دور دورہ تھا۔

یہ خلیفہ جاہ و جلال اور پاکیزہ خصائل کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے آباؤ اجداد کے برخلاف اہلبیتؑ اطہار کا بڑا معتقد اور دوستدار تھا۔ "مختصر اخبار الخلفاء" کے

مطابق یہ خلیفہ شیعہ تھا اور اپنے باپ دادا کے برخلاف مسلکِ امامیہ سے منسلک تھا۔اس نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے روضہ کو جائے امن قرار دیا۔جو بھی ملزم اس روضہ میں پناہ لیتا اس کی جان و مال کی امان ملتی اور حکومت اس سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کرتی۔لوگ اپنی حاجتوں، پریشانیوں اور جرائم میں اس روضہ کی پناہ لیتے۔ناصر اُن کی حاجتوں کو پورا کرتا، ان کی پریشانیوں کا ازالہ کرتا اور ان کی خطاؤں کو بخش دیتا۔

(مختصر اخبار الخلفاء مصنفہ علی ابن انجب ص:۱۱۱)

ناصر کے دورِ سلطنت میں کربلا معلیٰ اور دیگر عتبات مقدسہ جھلملا اُٹھے۔زائرین کی حوصلہ افزائی ہوئی اور اطراف و اکناف سے لوگ جوق در جوق کربلائے معلیٰ کی زیارت کو آنے لگے۔اپنی تقریباً نصف صدی کی حکومت میں انہوں نے حائر حسینیؑ کو غیر معمولی رونق بخشی۔ابن سہلان نے قبرِ مطہر پر پانچویں صدی کے آغاز میں جو روضہ تعمیر کیا تھا اُس کو تعمیر و تجدید کی چنداں احتیاج نہ تھی لیکن ناصر کو اہلبیت اطہارؑ سے جو غیر معمولی عقیدت و مودّت تھی اُس نے اسے بے چین کیا کہ اس عمارت کی جلال و جمال اور شکوہ و طمطراق میں مزید نکھار لائے۔چنانچہ اس نے اپنے وزیر مؤید الدّین محمد مقدادی قمی کو حکم دیا کہ حائر کی تزئین و آرائش میں اضافہ کیا جائے اور حسب ضرورت اس کی تعمیر ہو۔۶۲۰ھ میں جو ناصر کی زندگی کا آخری دور بھی تھا، وزیر نے روضۂ اقدس کی رونق و استحکام اور تزئین و آرائش میں غیر معمولی انہماک سے کام لیا۔روضے کی دیواروں پر ساکھو کی لکڑی چڑھائی۔ اور دیگر تمام دیواروں پر حریر و دیبا کے پردے لٹکائے۔ (مجالِ اللّطف ص:۴۱)

اسی قسم کی اصلاحات اور تزئین و آرائش دیگر عتبات عالیات میں بھی روبعمل لائی گئیں۔سامرہ میں بھی ایسا ہی عمل ہوا۔اس میں سرداب بھی بنایا گیا۔جس پر قیمتی آبنوس کی جالی بنائی گئی اور اس پر یہ آیت کندہ کرائی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ

دیواروں پر یہ عبارت کندہ کرائی:

بسم اللّٰه الرحمن الرحيم محمد رسول الله. امير المومنين علی ولی اللّٰه .فاطمة. الحسن بن علی. الحسين بن علی علی ابن الحسين محمد بن علی .جعفر بن محمد موسی بن جعفر علی ابن موسیٰ . محمد بن علی . علی ابن محمد الحسن ابن علی. القائم بالحق

(الکنی والالقاب شیخ عباس قمیؒ: جلد:۳ ص،۱۹۶ اعیان الشیعہ وغیرہ)

نویں فصل

روضہ حسینیؑ کی آٹھویں تعمیر

۷۶۷ھ میں بعہد سلطان اویس جلائری وجانشینان

۴۰۷ھ میں حائر حسینیؑ نذر آتش ہونے کے فوراً بعد سلطان الدولہ دیلمی کے وزیر ابن سہلان نے روضہ مبارک کو ازسر نو شاندار ڈھنگ سے تعمیر کرایا تھا۔ پھر عباسی خلیفہ ناصر الدین اللہ کے حکم سے ۶۲۰ھ میں اسکے وزیر مؤید الدین محمد مقدادقمی نے اس میں بہت کچھ اضافات اور آرائش کی۔ یہ عمارت تقریباً ۳۶۰ سال تک قائم ودائم رہی۔ پانچویں، چھٹی اور ساتویں صدی بخیر و عافیت گذری۔ آٹھویں صدی کا بھی بیشتر حصہ بطریق احسن بیتا۔ اس عمارت کو نہ کوئی گزند پہنچی نہ اسکی بے حرمتی ہوئی۔ اسی روضے نے عباسی حکومت کا زوال دیکھا اور منگولوں کی حکومت اور عراق میں جلائری بادشاہت کا بھی مشاہدہ کیا۔ یہی روضہ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے ۷۲۷ھ نے دیکھا اور اپنے سفرنامہ میں اس کا ان لفظوں میں تذکرہ کیا:

"پس ہم نے شہر کربلا کی طرف سفر کیا جہاں امام حسینؑ کا مزار مقدسہ ہے۔ یہ چھوٹا سا شہر ہے جس کے چاروں جوانب کھجور کے باغات ہیں اور فرات کا پانی اُنہیں سیراب کرتا ہے۔ اس کربلا میں بہت بڑا مدرسہ ہے اور ایک پاکیزہ جگہ، جہاں آنے جانے والوں کی ضیافت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ روضے کے دروازے پر حاجیوں اور خدام کا ہجوم رہتا ہے۔ ضریح پر سونے اور چاندی کی قندیلیں آویزاں ہیں۔ دروازوں پر ریشمی پردے لگے ہیں"۔ (رحلۃ ابن بطوطہ۔ جلد:۱ ص:۱۳۹ مطبوعہ مصر)

فی الوقت قبر شریف پر جو روضہ تعمیر ہوا ہے یہ وہ عمارت نہیں جو سلاطین آل بویہ نے بنوائی تھی جیسا کہ لوگوں میں غلط طور پر مشہور ہے، اس لئے کہ موجودہ عمارت ۷۶۷ھ کی تعمیر شدہ ہے اور اس وقت تک آل بویہ کی حکومت کے انحطاط کو زائد از تین سو سال کا عرصہ ہو چکا تھا، کیونکہ آل بویہ کی حکومت ۴۴۷ھ میں ختم ہو گئی تھی۔ اسی طرح یہ عباسیوں کی تعمیر کردہ بھی نہیں کیونکہ اُن کی حکومت کا زوال ۶۵۶ھ میں ہوا، بلکہ موجودہ عمارت سلطان اویس بن شیخ حسن الجلائری کے دور اقتدار میں تعمیر ہوئی۔ انہوں نے ابن بطوطہ کی سیاحت کے پورے چالیس برس بعد ۷۶۷ھ میں مسجد اور حائر حسینیؑ کی از سر نو تعمیر شروع کی۔ پھر سلطان اویس کے بیٹوں سلطان حسین اور سلطان احمد نے حائر کی عمارت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اس تعمیر کی تاریخ بھی ایک محل کے اوپر جو "نخلہ مریم" کے نام سے مشہور ہے درج تھی۔ اس تاریخ کو محمد بن سلیمان بن زویر سلیمانی نے جیسا کہ "تاریخ کربلائے معلیٰ" میں مذکور ہے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ تاریخ محل مذکور میں ۱۲۱۶ھ تک محفوظ رہی۔ اس سال وہابیوں نے اپنے سرغنہ ابن سعود کی قیادت میں کربلائے معلیٰ پر یورش کر کے زبردست غارتگری کی، لوٹ مار کی، تباہی مچادی، ہر سو تاخت و تاراج کیا اور دس ہزار سے زائد بے گناہ اور نہتے عورتوں، مردوں، بوڑھوں اور بچوں کو اپنے ہی خون میں نہلا دیا۔ اسی سال عثمانی ترکی سلاطین نے اس محل سے یہ تاریخ ہٹا دی اور اس کے آثار مٹا دیئے۔

سلطان اویس نے جو عمارت تعمیر کرائی تھی غالباً وہ بھی اپنی قدیم شکل وصورت پر باقی نہیں رہی بلکہ اس میں بہت سی اصلاحات وترمیمات ہوتی رہیں اور وقتاً فوقتاً نامی گرامی روسأ، اُمرأ، سلاطین شیعہ اور سلاطین ترکی وغیرہ کی طرف سے مزید اضافے ہوتے رہے۔

سلطان اویس جلائری کا عراق آنا اور اسی برس حرم اطہر کو ازسرنو تعمیر کرانا بھی ایک حسن اتفاق ہے۔ جب وہ جلائری سلطنت کے بانی اور اپنے والد شیخ حسن کے انتقال کے بعد عراق وخراسان کے بادشاہ ہوئے تو ان کا دارالخلافہ تبریز تھا۔ انہوں نے اپنے غلام امیر جان کو جو مرجان کے نام سے مشہور ہے بغداد کا گورنر مقرر کیا۔ مگر مرجان نے چاہا کہ عراق کا خود حاکم بن بیٹھے لہذا وہ باغی ہوگیا اور اپنے آقا کے احکام کی بجا آوری سے انکار کردیا۔ اویس نے اس کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر جرار روانہ کیا۔ جب یہ لشکر بغداد پہنچا تو مرجان نے اس کے مقابلہ کے لئے اپنے میں طاقت نہ پائی۔ اس کے ساتھی بھی اس کو بے یارومددگار چھوڑ کر اُس سے علاحدہ ہوگئے۔ اس کے بعد اس کیلئے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ اپنے آپ کو بادشاہ کے حوالہ کردے مگر اس صورت میں بھی اس کا قتل کیا جانا یقینی تھا۔ اس نے اپنے مخصوص رفقاً سے صلح ومشورہ کیا، جنہوں نے اُسے رائے دی کہ حضرت امام حسینؑ کے حرم اطہر میں جاکر پناہ گزین ہوجاؤ۔ چنانچہ وہ اپنا سارا مال ومتاع سمیٹ کر کربلا کی طرف فرار ہوا جبکہ سلطان اویس کامیاب وکامران بغداد میں داخل ہوا۔

ابن کثیر "البدایہ والنہایہ" جلد: ۱۴ کے صفحہ ۳۷۰ نے اس طرح یہ روداد لکھی ہے:۔

"اسی ماہ یعنی شعبان ۷۶۷ھ میں سلطان اویس بن شیخ حسن بادشاہِ عراق و خراسان نے مرجان کے ہاتھوں سے بغداد کو واپس لیا۔ یہ مرجان بادشاہ کی طرف سے نائب تھا۔ بعد میں بغاوت کر کے حلقۂ اطاعت سے باہر ہوگیا۔ سلطان اویس بہت بڑا لشکر لے کر آئے۔ مرجان بھاگ نکلا! اور سلطان اویس بڑے شان وشکوہ سے بغداد میں داخل ہوئے۔ ان کے داخلہ کا دن ایک یادگار دن تھا۔"

مرجان نے کربلا پہنچ کر حرم حسینیؑ میں پناہ لی۔ پھر وہ مشہور مینار بنوایا جو "مأذنہ عبد" کے نام سے مشہور تھا اور یہ مینار حائر حسینیؑ کے مشرقی پہلو میں مسجد سے ملحق تھا۔ بغداد و کربلا وغیرہ میں اسکے پاس جتنی دولت و ثروت اور جاگیریں تھیں وہ سب بعہدِ امام حسینؑ کے نام وقف کردیں اور اسکی ساری آمدنی مسجد اور مینار پر خرچ ہونے لگی۔

سلطان اویس کو جب اطلاع ملی کہ اس نے اپنی ساری دولت حرم حسینیؑ کے لئے وقف کردی ہے تو اسے معاف کردیا۔ پھر اسے حاضر خدمت ہونے کا حکم دیا۔ اس کے اس کام پر اس کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور دوبارہ بغداد کا گورنر مقرر کردیا۔ ابن کثیر نے بھی یہی تمام باتیں قلمبند کی ہیں کیونکہ وہ مرجان اور اویس شاہ دونوں کا ہم عصر تھا اور ان تمام واقعات کا چشم دید گواہ بھی۔ اس واقعے کے سات برس بعد ۷۷۶ھ میں سلطان اویس راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ بہر حال ابن کثیر نے ان واقعات کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے:

"سلطان اویس بادشاہ عراق و خراسان نے بغداد پر دوبارہ قبضہ کر کے مرجان کو اپنے پاس بلایا، اسکی عزت افزائی اور جان بخشی کی اور دونوں اس بات پر متفق ہوئے کہ فتنہ کا اصل بانی احمد نامی ایک امیر تھا جو وزیر کا بھائی تھا۔ بادشاہ نے اپنے سامنے بلا کر چھری سے اُس کا پیٹ پھاڑ ڈالا اور ایک افسر کے ذریعے اس کا کام تمام کروادیا"۔ (البدایہ والنہایہ جلد: ۱۴۔ ص: ۳۱۹)

جب سلطان اویس نے دیکھا کہ اس کے غلام نے حرم اطہر کی اتنی تعظیم کی اور اپنی ساری جائیداد اس کیلئے وقف کردی۔ حالانکہ چاہئے تھا کہ اس کام کو وہ خود کرتے۔ اس عمل سے تحریک پا کر انہوں نے حائر مقدس کو از سر نو تعمیر کرانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ پھر یہ کام ان کی زندگی میں شروع ہوگیا اور ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزندوں شاہ حسین اور شاہ احمد نے اس تعمیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ (مجالی اللطف بارض اللطف: ص ۴۱)

مرجان کا بنایا ہوا یہ مینار ۱۳۵۴ھ میں از راہ ظلم گرادیا گیا کیونکہ مرجان نے جو جائیداد اس مینار کیلئے وقف کردی تھی اس کو ہڑپنے کیلئے بس یہی ایک تدبیر تھی کہ مینار ہی کو اکھاڑ دیا جائے۔

پانچواں باب

پہلی فصل

روضہ حسینؑ کا تاخت و تاراج

اس کی تباہی، غارتگری، آتشزدگی اور انہدام

مختلف سفاک و جابر حکمران و سلاطین ہر دور میں حائرِ حسینیؑ کا تاخت و تاراج کرتے رہے۔ انہوں نے مشہد مشرفہ کو آئے دن اپنے وحشیانہ مظالم کا نشانہ بنایا۔ روضے کی عمارت کو منہدم کیا اور جو کچھ یہاں مال و اسباب یا نقد و زر ملا اُسے لوٹ لیا۔ لیکن غیرتمند مسلمانوں کے ہاتھوں ہر تاراجی و انہدام کے بعد پہلے سے بھی زیادہ شان سے اس روضے کی تعمیر اور آبادکاری ہوتی رہی اور حضرت امام سجادؑ کے اس ارشاد کی صداقت عیاں ہوتی رہی کہ:

"اس ارضِ کربلا پر قبرِ سیّد الشہداءؑ کو منارۂ ہدایت بنایا جائے گا، جس کے آثار ہمیشہ باقی رہیں گے اور صدیاں بیتتی رہیں گی مگر اس کے فیوض و برکات ہمیشہ جاری رہیں گے۔ رہبرانِ کفر اور پیروانِ ضلالت اس کا وجود مٹانے اور خاک میں ملانے پر اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر ڈالیں گے۔ لیکن اس کے اثرات روز افروں پروان چڑھتے رہیں گے اور اسے ہمیشہ رفعت و سرافرازی نصیب ہوتی رہے گی۔"

("الحسینؑ": علی جلال الحسینی جلد: ۲۔ ص: ۳۰۲۔ مطبوعہ مصر)

جن لوگوں نے روضہ حسینؑ کی غارتگری اور تاخت و تاراجی اور اس کے آثار و نشانات مٹانے یا اس کی قدر و منزلت گھٹانے اور اس کی حرمت لوٹنے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حصہ لیا وہ دو طرح کے تھے۔ ایک ائمہ کفر جو خلیفۃ المسلمین کا لقب اختیار کر کے

مسلمانوں کی گردنوں پر سوار تھے دوسرے پیروان ضلالت اور انکے حوالی موالی۔ ارباب اقتدار جو خلیفتہ المسلمین بنے وہی ائمہ کفر تھے اور ان کے کارندے جواُن کے احکام کو عملی جامہ پہناتے تھے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم پیروان ضلالت اور اُنکے حوالی موالی تھے۔

حرم مقدس کو پہلی صدی سے ہی کئی بار بہت بُرے دن دیکھنا پڑے، ایسے ایام میں ائمہ کفر اور ان کے چیلوں اور پیروکاروں نے فرزندِ رسولؐ کی قبر اطہر کو منہدم کرنے اور حائر مقدسہ کے آثار اور عزت وحرمت کو برباد کرنے کی امکانی کوششیں کیں، مگر جب بھی انہوں نے ایسے اوچھے ہتھکنڈے آزمائے حائرِ حسینیؑ کی شان وشوکت میں اور اضافہ ہوا اور پہلے سے بھی زیادہ لوگوں کے دل اس کی طرف کھینچتے چلے آئے۔

شہادت امام حسینؑ کے بعد بنی امیہ کی سلطنت کے زوال تک جتنا عرصہ بیت گیا غالباً وہی زمانہ حائر حسینیؑ کیلئے زیادہ سکون وعافیت کے ساتھ گزرا اس لئے کہ بنی امیہ نے امام مظلومؑ پر جتنے مظالم ڈھائے تھے انہوں نے اسی پر اکتفا کیا اور مزید مصائب ڈھانے کی جسارت نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ واقعۂ حرہ کے موقعے پر عبدالملک بن مروان نے اپنے گورنر حجاج بن یوسف ثقفی جیسے ہلاکوئے وقت کو یہ تاکیدی خط لکھا تھا:۔

"اولاد ابی طالبؑ کا جتنا خون بہہ چکا ہے وہی کافی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جب سے اولاد ابی سفیان نے ان کا خون بہایا ہے موت اُن سے مانوس ہوگئی ہے"۔

اسی سبب حجاج نے اہلبیتؑ نبوت سے بہت کم چھیڑا۔ خوفِ خدا سے نہیں بلکہ اس ڈر سے کہ کہیں حکومت بیخ وبن سے اکھڑ نہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بنی اُمیّہ نے قبر مطہر سے ویسا تعرض نہیں کیا جیسا کہ ان کے بعد بنی عباس نے کیا۔ البتہ بنی امیہ نے یہ ضرور کیا کہ قبر مطہر کے گردونواح میں فوجی چوکیاں قائم کردیں۔ جہاں ہتھیاروں سے لیس سپاہی ہروقت چوکس رہتے اور کسی زائر کو قبر مطہر کے پاس آنے جانے نہیں دیتے۔ جو آجاتا اُسے قتل کر

ڈالتے، سولی پر لٹکاتے، ہاتھ پیر کاٹ ڈالتے اور سخت سے سخت ایذائیں دیتے لیکن جیسے ہی بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور بنی عباس مسندِ اقتدار پر متمکن ہوئے تو انہوں نے حائر حسینیؑ پر تخریب کاری اور غارتگری شروع کی۔ کئی بار ضریحِ مقدسہ کو منہدم کیا اور اُس کے آثار مٹانے کا معمول بنالیا۔ اُن کے ہی دور سے اس ہولناک بدعت کا سلسلہ جاری ہوا۔

حائر مقدس کی پہلی بربادی

منصور کے ابتدائے دور اقتدار میں

خلفائے بنی عباس میں جس حکمران نے اس بدعت کی شروعات کی وہ منصور دوانقی ہے، وہی ظلم کا بانی اور حائر و قبر مطہر منہدم کرنے والوں کا باوا آدم ہے۔ جب بنی عباس کا اقتدار قائم ہوا اور اُن کی حکومت کو پوری طرح استحکام حاصل ہوا اور انہوں نے بنی اُمیہ کو چُن چُن کر ختم کر کے داخلی شورشوں کا قلع قمع کیا تو پھر انہوں نے کھل کر آل ابی طالبؑ کے ساتھ بغض وعناد کا اظہار کرنا شروع کیا جو سفاح کے دور تک پوشیدہ رہا تھا مگر منصور کے مسندِ اقتدار پر بیٹھتے ہی بڑی شدومد سے منظر عام پر آگیا۔ اُس نے حضرت امام حسنؑ کی اولاد میں جتنی سرکردہ اور نمایاں شخصیات تھیں سبھی کو ایک ایک کر کے شہید کیا۔ وہ اس بیعت کے انتقام میں جو کچھ عرصہ قبل وہ محمد نفس الزکیہؒ بن عبداللہؒ بن حسن مثنیٰؒ کے ہاتھ پر کر چکے تھے۔ پھر یہ شقاوت وعداوت زندوں سے گذر کر مُردوں تک جا پہنچی۔ علویوں سے اس کی عداوتِ قلبی اور ان کا وجود مٹا دینے کی فکر نے اسے آمادہ کیا کہ قبر حسینیؑ سے بھی تعرض کرے۔ اسکے طرزِ عمل نے بعد میں آنے والے حکمرانوں کیلئے بھی راہ کھول دی، پھر جو بھی تخت پر بیٹھا اس نے علویوں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ روضۂ حسینیؑ کو منہدم کرنے کی بھر پور کوشش کی۔

منصور کا ظلم وستم اور غرور اس قدر بڑھا کہ اُس نے شریعت اسلامیہ کی کچھ اس

طرح دھجیاں اُڑائیں کہ اس کے دور کے بڑے بڑے فقہاً اور مرجع خلائق بزرگوں نے اس کی سخت وشدید مخالفت کی۔ مذاہب اربعہ کے دوائمہ جو منصور کے دور میں گزرے یعنی امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ۔ امام مالکؒ نے اہلِ مدینہ کو یہ فتویٰ دیا کہ منصور نے جو بیعت لی ہے وہ ناجائز ہے کیونکہ یہ جبراً لی گئی ہے خوشی خاطر نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ نے تو اس سے ایک قدم آگے بڑھکر پوری ہمت وجرأت سے علانیہ طور یہ فتویٰ صادر کیا کہ منصور اور اس جیسے دوسرے لوگ اگر مسجد بنانا چاہیں اور مزدور وکاریگر ڈھونڈیں تو کسی کو اُن کی مزدوری کرنا جائز نہیں اسلئے کہ یہ لوگ فاسق ہیں اور فاسق امام بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ امام حنیفہؒ کا یہ حکم اکثر مفسرین کے نزدیک قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے استنباط کردہ ہے۔ خداوند عالم نے جناب ابراہیمؑ سے کہا تھا ''اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا'' میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ ابراہیمؑ نے سوال کیا ''وَمِنْ ذُرِّیَتِی'' اور میری ذریت سے، جواباً ارشاد ربانی ہوا'' لا یَنَالُ عَھْدِی الظَّالِمِیْنَ''۔ ظالمین میرے عہد کو نہیں پا سکتے۔

منصور کو جب ابوحنیفہؒ کے اس فتویٰ کا علم ہو گیا تو اس نے ابوحنیفہؒ کو گرفتار کرایا یہاں تک کہ قید خانہ ہی میں وہ انتقال کر گئے۔ ابوحنیفہؒ نے اسی فتویٰ کی بنا پر زندان کی سختیاں جھیلیں۔ اسی چیز نے شیعوں کے دل میں ان کی محبت اور ان کیلئے نرم وخوشگوار جذبات پیدا کردیئے جیسا کہ مجلسیؒ نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الائمہ'' کے صفحہ ۱۳۰ پر ذکر کیا ہے (مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو امام جعفر صادقؑ در کتاب The Shia Religion By.D.M Donaldson1933)۔

مالک ابن انسؒ کے متعلق منصور نے اپنے عاملِ مدینہ جعفر بن سلیمان کو حکم بھیجا کہ امام مالکؒ کو ستر کوڑے مارے جائیں، پھر نجانے کیا اس کے دل میں آیا کہ اس نے اپنے عامل کو اس حرکت کے انجام دہی سے روکا اور امام مالکؒ سے معذرت طلب کی۔

(الامامتہ والسیاستہ: ابن قتیبہ جلد: ۲۔ ص ۱۶۲ مطبوعہ مصر)

فصل دوم

حائر حسینیؑ کی دوسری بربادی

۱۹۳ھ میں بعہدِ ہارون رشید

منصور کے بعد ہارون رشید نے اپنی خلافت کے آخری دور میں حائر حسینیؑ کو منہدم کیا۔ اس نے قبر حسینیؑ کھدوا کر زمین کے برابر کرادی۔ حتیٰ کہ بیر کا وہ درخت بھی جڑ سے کٹوا دیا جو قبر مبارک کے پاس اُگا ہوا تھا تاکہ قبر کے تمام آثار مٹ جائیں۔ حالانکہ ان کی خلافت کے ابتدائی دور میں اس کی روش بڑی متوازن رہی۔ الطاف وعنایات، قریبی رشتہ داروں کے ساتھ حُسن سلوک اور آلِ ابوطالبؑ کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ اس کا بلکل ویسا ہی رہا جیسا کہ اس کے باپ مہدی کا رہا تھا لیکن انجام کار اس کی روش یکسر تبدیل ہوگئی اور اس نے علویوں کی مخاصمت اور شقاوت پر کمر کس لی۔ اس نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کو گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا حتیٰ کہ قید خانہ ہی میں آپ کی شہادت واقع ہوئی۔ مدینہ میں جو سادات علوبین رہتے تھے ہارون نے اپنے دادا منصور کی پیروی کرتے ہوئے ان کا جینا دوبھر کردیا۔ اس نے یحییٰؒ بن عبداللہؒ بن حسن مثنیٰؒ کو خود اپنے ہاتھ سے امان نامہ لکھ کر دیا تھا جبکہ انہوں نے دیلم میں حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، لیکن بعدازاں خود اپنے ہی ہاتھوں اس امان نامے اور اپنے عہد و پیان کو پھاڑ دیا۔ انہیں اسیر کرا کے خفیہ تدبیروں سے شہید کر ڈالا۔ جعفر بن یحییٰ برمکی جو اُس کا انتہائی محبوب وزیر تھا کو انتہائی سفاکانہ اور وحشیانہ طور قتل کیا اور اُس کے ساتھ ساتھ اُس کے پورے خاندان برامکہ کو کچل ڈالا۔

تخت نشینی کے بعد سترہ برس تک قبر حسینیؑ کے متعلق ہارون کے منصوبے اور ارادے مخفی رہے۔ یعنی ۱۷۰ھ سے لیکر ۱۸۷ھ تک کچھ ظاہری رکاوٹوں کے سبب اُسے اپنے

منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ نہیں ملا لیکن اس کے بعد وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ علویوں کے بغض وعناد سے وہ جل بھن رہا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں ان کی روز افزوں عقیدت اور مقبولیت وجلالت اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی، پھر زائرین کے حرم حسینیؑ کی زیارت کو جوق در جوق آنے نے اس کی نیند حرام کی۔ قبر حسینیؑ پر اس اژدحام نے اس کے آتش غضب کو اور بھی بھڑکا دیا۔ اس دور میں کربلا معلیٰ اور حرم حسینیؑ کا جو بہترین انتظام و انصرام تھا، حجّاب اور خدّام روضہ اقدس کی جو غیر معمولی تعظیم وتکریم کرتے اور دیکھ بھال میں جی جان لڑاتے رہتے اس کو دیکھ کر ہارون اور بھی آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے روضہ اقدس کے خادم ابن ابی داؤد کو فوراً حاضر کئے جانے کا حکم دیا۔ جب ابن داؤد اس کے سامنے حاضر ہوا تو اس نے انتہائی غیظ وغضبناک لہجے میں اس سے پوچھا۔

تم حائر حسینیؑ میں کس کے حکم سے رہتے ہو؟

ابن ابی داؤد نے کہا: حسن بن راشد (جو اکابرین شیعہ اور حضرت امام جعفر صادقؑ کے خاص شاگردوں میں سے تھا) نے مجھے وہاں تعینات کر رکھا ہے۔

ہارون نے غصہ میں سر کو جھٹکا اور کہا ابھی حسن کو میرے پاس بلاؤ۔ حسن بن راشد کے آنے پر ہارون نے پوچھا۔ ''تم نے اُس شخص کو حرم کی خدمت پر کیوں مامور کر رکھا ہے؟''

حسن نے کہا خدا کی رحمتیں اس پر نازل ہوں جس نے اُسے مامور کیا ہے۔ مجھے مادر موسیٰ (یعنی مہدی کی ماں، ہارون کی دادی) نے حکم دیا تھا کہ اس شخص کو وہاں مقرر کروں اور ہر مہینہ تیس درہم اسے مشاہرہ بھی دیا کروں۔ یہ سن کر ہارون کو سکتہ طاری ہو گیا اور اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو اس نے کہا اچھا اسے پھر وہیں بھیج دو اور مادر موسیٰ نے اس کی جو تنخواہ مقرر کر رکھی ہے اسے ہر ماہ دی جاتی رہے۔ (تاریخ طبری جلد:۱۰،ص:۱۸)

اس موقعے پر تو ہارون رشید نے ابن ابی داؤد سے چشم پوشی کی اور بظاہر وہ روایت

جاری رکھی جو مادر موسیٰ خلیفہ مہدی کی ماں کے دور سے رائج تھی۔ لیکن بعد ازاں اُس نے انتہائی خطرناک قسم کے اقدامات اُٹھانے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ چنانچہ اس کے سینے میں بھڑکتی ہوئی آتش بغض و شقاوت نے اسے برانگیختہ کیا کہ کربلائے معلّٰی کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکے اور ان تمام مکانات کو بھی زمین بوس کردے جو حرم کے گرد و نواح میں واقع تھے، بیر کا درخت کٹوا ڈالا جائے اور سرزمین حائر پر ہل چلوا دیا جائے تاکہ قبرِ مطہر کے تمام آثار مٹ جائیں جیسا کہ اکثر مورخین و محدثین نے بیان کیا ہے۔ شیخ طوسیؒ "امالی" میں بسلسلۂ اسناد یحییٰ بن مغیرہ رازی سے روایت کرتے ہیں:-

"میں جریر بن عبدالحمید کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ عراق کا ایک شخص وہاں پہنچا، جریر نے لوگوں کی خیر و عافیت دریافت کی تو اُس شخص نے کہا کہ میں نے ہارون رشید کو اس حال میں چھوڑا کہ اس نے قبر حسینؑ کو کھود ڈالا ہے۔ قبر مبارک کے سرہانے جو بیر کا درخت تھا وہ بھی کاٹ دیا گیا ہے۔ جریر نے ہاتھ اٹھا کر کہا! اللہ اکبر، اس کے بارے میں رسول اللہ کی حدیث ہم تک پہنچ چکی ہے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا تھا! اللہ بیر کا درخت کاٹنے والے پر لعنت فرمائے۔ یہ جملہ آپ نے تین مرتبہ فرمایا۔ ہم اس وقت اس حدیث کا مطلب نہیں سمجھے تھے، لیکن آج مطلب آشکار ہوا۔ بیر کا درخت کاٹنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ حسینؑ کی جائے شہادت کا لوگوں کو پتہ نہ چلے، کسی کو معلوم نہ ہو کہ حسینؑ کی قبر کہاں ہے"۔ (امالی شیخ طوسیؒ ص:۲۰۶ طبع ایران)

سید محمد ابن ابی طالب نے بھی اپنی کتاب "تسلیۃ المجالس" میں یہ واقعہ کچھ ایسی ہی عبارت میں بیان کیا ہے:-

"امام حسینؑ کی قبر پر ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی جو بنی اُمیہ کے عہد میں موجود تھی بلکہ بنی عباس کے اوّلین دور میں بھی ایک مدّت تک باقی تھی۔ ہارون رشید نے اپنے دور

میں اُسے کھنڈر بنا دیا۔ بیری کا وہ درخت کٹوا دیا جو قبر حسینؑ کے پاس اگا ہوا تھا اور قبر کی جگہ کو زمین کے برابر کر دیا"۔ (مناقب شہر بن آشوب جلد: ۳ ص۔۱۸۹)

ہارون رشید نے سادات علویین اور حرم حسینؑ پر جو بھیانک ترین اور لرزہ خیز مصائب کے پہاڑ ڈھائے اس کی توثیق و تائید علامہ طقطقیؒ کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہوتا ہے، مورخ اپنی تاریخ "الفخری" کے صفحہ: ۱۷ پر کچھ اس طرح خامہ فرسا ہیں:۔

"ہارون رشید کو اللہ کا قطعی خوف نہ تھا۔ اس نے سادات علویین پر جو بے جرم و خطا بھیانک ترین مظالم کیئے حالانکہ وہ حضرت فاطمہؑ دختر پیغمبرؐ خدا کی اولاد تھے، بیّن ثبوت ہیں کہ اُسے اللہ کا کوئی خوف نہ تھا"۔

علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار جلد: ۱۰، ص ۲۹۴ و ۲۹۵ پر پوری تفصیل سے اس کی روداد لکھی ہے کہ ہارون رشید نے کیونکر اور کیسے قبر حسینؑ کو تاراج کیا، وہ زمین کھدوا ڈالی اور موسیٰ بن عیسیٰ بن موسیٰ عباسی گورنر کوفہ کے ذریعہ وہاں کے تمام آثار معدوم کروادئے۔

حرم حسینؑ کو منہدم کرنے کے بعد ہارون بھی زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکا۔ وہ بغداد سے رے پہنچا، وہاں سے خراسان گیا کہ راستے ہی میں بیماری اس پر مسلط ہوئی۔ اس کے معالج جبریل بن بختیشوع نے غلط ملط دوائیں دیدیں جس سے اس کی بیماری اور بڑھ گئی۔ رشید کو اس کا احساس ہو گیا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ صبح سویرے ہی بختیشوع کے اعضائے بدن ٹکرے ٹکرے کر ڈالوں گا مگر صبح دیکھنی اس کے مقدر میں نہ تھی۔ اسی رات وہ راہی مُلکِ عدم ہوا۔ طبیعت زیادہ بگڑنے پر ہارون نے بختیشوع کو بلا وا بھیجا۔ مگر اس نے ایک رات کی مہلت مانگی اور کہا کہ حضور! کل صبح تک آپ ضرور تندرست ہو جائیں گے۔ اسی رات بختیشوع فرار ہوا اور صبح ہوتے ہوتے ہارون کی زندگی کی بتی گل ہو گئی۔ یہ واقعہ ۳ رجمید الثانی ۱۹۳ھ کو پیش آیا۔ انتقال کے بعد ہارون اس جگہ دفن ہوا جس جگہ دس سال

بعد امام رضاؑ دفن کئے گئے۔ مامون نے امام رضاؑ کو زہر دغا سے شہید کر کے اسی جگہ دفن کیا جہاں دس سال قبل اُس کا باپ ہارون دفن کیا گیا تھا۔ غرض یہ تھی کہ امام رضاؑ کی ہمسائیگی سے میرے باپ کو بھی وہ عظیم شرف حاصل ہو جو حضرت ابوبکر و عمر کو جوار رسولؐ میں دفن ہونے پر نصیب ہوا۔ علامہ عباس محمود العقاد نے اس تعلق سے کیا ہی خوب فقرہ کسا ہے، وہ ہارون رشید کی روح کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

''دراصل بنی عباس کو شدید اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں علیؑ کے پیروکار تیری قبر کو بھی کھود نہ ڈالیں، لہٰذا اسی جگہ امام رضاؑ دفن کئے گئے تاکہ ان کے صدقے تیری میت اہانت اور تیری قبر کھدنے سے بچ پائے۔ دنیا کی بوالعجبی اور نیرنگی دیکھئے کہ اولادِ علیؑ تیری طویل و عریض سلطنت میں پناہ ڈھونڈھتے پھریں اور ان پر تیری مملکت کی سرزمین تنگ ہو جائے اور تیرے حوالی موالی مرنے کے بعد تیرے جسد خاکی کے محفوظ رہنے کے لئے جائے پناہ ڈھونڈتے پھریں اور انہیں کوئی جگہ میسر نہ ہو پائے، سوا ایسے بزرگوں کی قبروں کے جنہیں تیری مملکت میں جان بچانے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔''

(رسالہ الہلال مصر: ماہ اکتوبر ۱۹۴۷ء ص: ۲۵ استاد عقاد کا مضمون حدیث مع ہارون رشید)

خواہ آج کل کے صاحبانِ قلم اور مورخین اس حقیقت پر دھیان نہ دیں مگر خود ہارون رشید کے دور کے لوگوں نے اس حقیقت کا ادراک ہی نہیں بلکہ اس کا برملا اعلان کیا تھا۔ مشہور و معروف شاعر دعبل خزاعیؒ امام رضاؑ اور ہارون کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قَبْرَانِ فِیْ طُوْسِ خَیْرُ النَّاسِ کُلِّھِمْ   وَقَبْرُ شَرِّھِمْ ھٰذَا مِنَ الْعِبَرِ

(طوس میں دو قبریں ہیں ایک اس شخص کی جو تمام خلائق سے بہتر و افضل تھا۔ دوسرے اس شخص کی جو بدترین مخلوق تھا۔ یہ بات بڑی عبرت خیز ہے)

مَا يَنفَعُ الرِّجْسُ مَنْ قُرْبَ الزَّكِيْ   وَمَا عَلَى الزَّكِيْ بِقُرْبِ الرِّجْسِ مِنْ جَوْرٍ

(گندہ وناپاک کو پاک و پاکیزگی کی نزدیکی سے کوئی نفع نہیں پہنچتا اور نہ ہی پاک و پاکیزہ کو گندہ وناپاک کی نزدیکی سے کوئی نقصان)

هَيْهَاتُ كُلُّ امْرِئٍ رَهْنٌ بِمَا كَسَبَتْ   لَهُ يَدَاهُ فَخُذْ مَا شِئْتَا وَفَذَر

ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا اسیر ہے۔ یہ اسی کے ہاتھوں میں ہے کہ وہ کسی چیز کو انتخاب کرے یا چھوڑ دے (عیون اخبار الرضاؑ ص:۳۶۰)

تیسری فصل

متوکل کے ہاتھوں روضۂ حسینیؑ کی تاراجیاں

۲۳۳ھ، ۲۳۶ھ، ۲۳۷ھ اور ۲۴۷ھ میں

حرم حضرت امام حسینؑ کو ہارون رشید کے ہاتھوں تاخت وتاراج اور اجڑے ہوئے چالیس سال سے زیادہ کا وقفہ گذرا تھا کہ اس کے پوتے متوکل کا دور آ پہنچا اور حائر مقدس کو پھر ایسی ہی غارتگری اور بربریت کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس نے اپنے پندرہ سالہ دورِ اقتدار میں چار مرتبہ مختلف اوقات میں روضہ کو منہدم کیا، زمین تک کھدوا ڈالی اور اپنے اسلاف منصور اور رشید کی پیروی کرتے ہوئے قبر مبارک کے آثار معدوم کئے۔

اگر متوکل کو عرب کا نیرو کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اُس نے شقاوت و درندگی کی انتہا کر دی۔ اسی کے دور سے مسلم شہنشاہیت کو گرہن لگنا شروع ہو گیا اور حکومت کے رگ وریشہ میں فساد سرایت کر گیا جبکہ متوکل دن رات طرب ونشاط، شراب و کباب، مستی و اوباشی میں ڈوبا رہتا۔ وہ ہر وقت شراب کے نشہ میں دھت رہتا۔ اس کے دور میں رعایا کا کوئی طبقہ ایسا نہیں رہا ہوگا جسے چین وسکون فراہم تھا۔ سرکاری ملازمین میں جتنے دانشور اور

فعال کارکن تھے وہ ایک ایک کر کے نکال باہر کر دئے گئے۔ معتزلہ کے تمام نمایاں اکابرین کو قید خانوں کی زینت بنایا گیا، ان کا مال واسباب اور جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ علی ابن ابی طالبؑ اور ان کے اہلبیتؑ کا بغض وعناد اس انتہا کو پہنچا کہ کربلائے معلیٰ کو منہدم کروادیا، وہاں پر ہل چلوادیا اور نہر کاٹ کر اس سرزمین کو غرقاب کرنے کی کوشش کی گئی۔ بایں ہمہ لوگوں کو وہاں کی زیارت کے بجالانے سے سختی سے روکا، دھمکی دی کہ جو حکم کی عدولی کرے گا اسے عبرتناک سزائیں دی جائیں گی۔ علویین سے فدک چھین کر سرکاری جائیداد قرار دے دیا گیا۔ (تاریخ عرب سید امیر علی۔ ص: ۲۴۷: مطبوعہ مصر)

علامہ ابوالفرج اصفہانی اپنی کتاب ''مقاتل الطالبین'' میں خامہ فرسا ہے:۔

''متوکل آل ابی طالبؑ کا سخت ترین دشمن اور ان کی جماعت کا بے انتہا مخالف تھا، وہ اُنکے خلاف شدید بغض وعناد، غیظ وغضب اور از حد بدگمانیاں رکھتا۔ اتفاقاً اس کو وزیر بھی ایسا ہی ملا جو خود بھی سادات کا ازلی دشمن تھا یعنی فتح بن خاقان۔ سادات کے تئیں ہر بدسلوکی اور ایذارسانی کی وہ کھلے دل تائید کرتا اور متوکل کو مزید تحریک وتحریص دلاتا۔ جسکا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ متوکل کے دور میں سادات کی وہ درگت ہوئی جو اس سے پہلے کسی عباسی خلیفہ کے عہد میں نہیں ہوئی تھی۔ اسی عداوت و درندگی نے اُسے قبر حسینؑ کو منہدم کرنے اور اُسکے آثار ونشانات مٹانے کے لئے بھی ابھارا۔ اُس نے کربلا جانے والی تمام راستوں کی ناکہ بندی کر کے ان پر مسلح فوج بٹھادی تھی۔ جس زائر کو سپاہی گرفتار کر لیتے اُسے متوکل کے پاس لے جاتے۔ متوکل یا تو اس زائر کو قتل کر ڈالتا یا انتہائی بھیانک سزا دیتا۔'' (مقاتل الطالبین: طبع ایران۔ ص: ۲۰۳۔۲۰۴)

دیگر مورخین نے بھی متوکل کو ایسی بربریت اور ایسی بداعمالیوں پر خوب آڑے ہاتھوں لیکر اپنی برہمی وناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ علامہ طبری وابن کثیر لکھتے ہیں:۔

''متوکل علیؑ اور ان کے اہلبیتؑ سے شدید ترین شقاوت وعداوت رکھتا تھا۔ جس کسی فرد کے متعلق اُسے اطلاع مل جاتی کہ وہ علیؑ اور ان کے اہلبیتؑ کو دوست رکھتا ہے وہ اس کا مال واسباب بھی لوٹ لیتا اور جان بھی لے لیتا''۔ (تاریخ طبری و تاریخ کامل حالات ۲۳۶ھ)

کچھ ایسی ہی سرگذشت علامہ ابو الفداء نے بھی اپنی تاریخ میں ۲۳۶ھ کے واقعات کے تناظر میں بیان کی ہے:-

''متوکل علیؑ اور ان کے اہلبیتؑ سے شدید ترین بغض وعناد رکھنے والا تھا''

(تاریخ ابو الفداء جلد: ۲۔ در واقعات ۲۳۶ھ)

اسی بدترین شقاوت ووحشیانہ پن نے اُسے قبرِ حسینؑ کو بھی اپنی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنانے کے لئے اُبھارا۔ چنانچہ اس نے حکم صادر کیا کہ روضۂ حسینؑ کو منہدم کردیا جائے، وہاں کی ارضِ پاک جوت لی جائے اور ہل چلا کر وہاں کھیتی کی جائے۔ اُس نے اپنے دور اقتدار میں ۲۳۲ھ سے لیکر ۲۴۷ھ تک چار مرتبہ یہ گھناؤنی حرکت سرانجام دی۔

ماہ شعبان ۲۳۳ھ میں

متوکل کے ہاتھوں روضۂ حسینؑ کی پہلی تاراجی

علامہ ابو الفرج اصفہانی نے ''مقاتل الطالبین'' میں اسکی وجہ یوں قلمبند کی ہے:

''متوکل ابھی خلیفہ نہیں ہوا تھا، اس وقت کوئی مشاطہ اور نائکہ اپنی طوائفوں کو متوکل کے پاس بھیجا کرتی کہ جب وہ شراب پیئے تو وہ گانا گا کر اس کی کیف ومستی میں اضافہ کریں۔ خلیفہ ہونے پر اس نے نائکہ کے پاس آدمی بھیجا، اطلاع ملی کہ وہ کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔ وہ نائکہ امام حسینؑ کی زیارت کو گئی تھی۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ متوکل کا آدمی بلانے آیا تھا تو وہ فوراً واپس آئی اور اپنی کنیزوں میں سے اس کنیز کو متوکل

کے پاس بھیجا جو اس کو بہت محبوب تھی۔ متوکل نے اُسے پوچھا تم سب کہاں چلی گئیں تھیں۔ وہ درجواب بولی کہ میری مالکن حج کو گئی تھی اور ہم لوگ بھی اس کے ہمراہ گئیں ہوئی تھیں۔ چونکہ وہ شعبان کا مہینہ تھا۔ متوکل نے پوچھا یہ شعبان میں کیسا حج ؟ کنیز نے بتایا کہ ہم لوگ حائر حسینیؑ کی زیارت کو گئے تھے۔ یہ سن کر متوکل غصے سے آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے فوراً ہی نائکہ کو گرفتار کر کے زندان میں ڈالدیا، اس کا سارا مال و متاع ضبط کیا اور اپنے ایک خاص آدمی کو جس کا نام دیزج تھا جو یہودی الاصل تھا اور پھر مسلمان ہو گیا تھا کربلا روانہ کیا اور حکم دیا کہ روضہ کو منہدم کر کے گردونواح میں جتنے مکانات ہیں سب کو کھنڈر بنا دو۔ دیزج نے حکم کی تعمیل کر کے آس پاس کے سارے مکانات زمین بوس کر دیے، روضہ کی عمارت منہدم کر ڈالی، دوسو جریب کے قریب ضریح کے اردگرد کی زمین بھی کھدوا ڈالی۔ اب صرف قبر بچی تھی۔ اس کو منہدم کرنے سے مزدوروں نے انکار کر دیا۔ پھر اس نے اپنے خاندان کے یہودیوں کو جا کر بلا لایا۔ جنہوں نے قبر مبارک کو اجاڑ دیا۔ پھر قبر کے گرد پانی بہا دیا گیا۔ آدھے آدھے میل پر فوجی چوکیاں قائم کیں جس میں ہر وقت سپاہی چوکس رہتے اور جس کسی زائر کو پاتے گرفتار کر کے متوکل کے پاس بھیجتے۔ وہ اسے قتل کر ڈالتا یا سخت ترین سزائیں دیتا"۔

(مقاتل الطالبین: ص ۲۰۳-۲۰۴ شرح شافیہ ابوفراس ص: ۲۰۷ طبع ایران)

ابوالفرج کی متذکرہ روایت سے عیاں ہوتا ہے کہ قبر مبارک کا اوّلین انہدام ماہ شعبان ۲۳۳ھ کو رونما ہوا جو متوکل کی حکومت کا پہلا سال تھا۔ مسلمان مزدوروں نے قبر مبارک کو منہدم کرنے کی ہرگز جرأت نہیں کی۔ دیزج جو یہودی نژاد تھا، نے اپنی قوم کے افراد کو بلایا اور یہودیوں ہی نے اس بار یہ فعل انجام دیا۔ دیزج نے متوکل کے حکم کے مطابق صرف قبر حسینیؑ ہی کے انہدام پر اکتفا نہیں کی بلکہ قبر کے چاروں اطراف جتنے

مکانات بنے ہوئے تھے سبھی زمین بوس کردیے یعنی کربلا کا پورا شہر مسمار کیا گیا۔ اس نے کربلا کے چاروں طرف فوجی چوکیاں قائم کیں تاکہ زائرین کو قبر تک پہنچنے نہ دیا جائے اور یہ سارے وحشیانہ اور لرزہ خیز مظالم متوکل نے محض اس وجہ سے ڈھائے کہ وہ اپنی شراب نوشی اور کیف وسرود کے وقت چند لمحوں کیلئے ایک طوائف کا گانا سننے سے محروم رہا۔

اس واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عباسی خلفاً نے اپنے طرب ونشاط کی خاطر کیسے کیسے بھیانک اور ہولناک مظالم کئے ہوں گے۔ اس انہدامی اور تخریبی کاروائی کا ارتکاب ۲۳۳ھ میں عمل میں آیا جو متوکل پہلا سال حکومت تھا۔ یہ کنیز متوکل کے پاس اسکے تخت نشین ہونے کے پہلے ہی سے آتی جاتی رہتی تھی۔ متوکل ۶ ر ذی الحجہ ۲۳۲ھ کو سریر آرا ہوا۔ اس نے شعبان میں اس نائکہ کے پاس آدمی بھیجا اور وہ اس وقت حاضر نہ تھی۔ اس روایت کے سیاق وسباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس کی حکومت کا پہلا شعبان ہی تھا۔

متوکل کے ہاتھوں ۲۳۶ھ میں قبر حسینؑ کا دوسرا انہدام

متوکل نے ۲۳۶ھ میں حائر حسینؑ پر دوسری مرتبہ یلغار کروادی اور حکم دیا کہ اسے پھر منہدم کر کے زمین کے برابر کردیا جائے۔

آثار وقرائن سے عندیہ ملتا ہے کہ متوکل نے جب پہلی مرتبہ مرقد حسینؑ کا انہدام عمل میں لایا تو جلد ہی یہ روضہ دوبارہ تعمیر ہوا ہوگا۔ اسی طرح اس کے گردونواح میں بھی پہلے کی طرح مکانات بن گئے، مگر تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ اس مختصر سی مدت میں یعنی ۲۳۳ھ اور ۲۳۶ھ کے درمیان قبر مطہر کی ازسرنو تجدید کس کے ہاتھوں ہوئی۔ غالباً اُن ہی لوگوں نے یہ مستحسن فعل انجام دیا ہوگا جنھوں نے کربلا میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

۲۳۶ھ میں متوکل کے ہاتھوں کربلائے معلیٰ کی اس دوسری تاراجی کو بھی تقریباً

تمام مورخین نے ذکر کیا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۲۳۳ھ کے انہدام سے بھی زیادہ ہولناک اور لرزہ خیز بربریت تھی کیونکہ اس کا حوالہ تمام تاریخی کتابوں میں ملتا ہے اور کسی نے بھی اسے نظر انداز کرنے کی جسارت نہیں کی ہے۔

طبری اور ابن اثیر ۲۳۶ھ کے واقعات کے حوالے سے یوں خامہ فرسا ہیں:-

''متوکل نے قبر حسینؑ منہدم کردینے اور اس کے گردونواح میں جو مکانات تھے انہیں کھنڈر بنا دینے کا حکم دیا۔ نیز یہ کہ اس سرزمین پر ہل چلا دیا جائے، نہر کاٹ کر لائی جائے اور لوگوں کو وہاں آنے سے منع کر دیا جائے۔ چنانچہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس علاقہ کے پولیس افسر نے منادی کرادی کہ آج کے بعد تیسرے دن جو شخص قبر حسینؑ کے پاس پایا جائے گا وہ قید کر دیا جائے گا۔ تمام لوگ وہاں سے فرار ہوگئے اور قبر کے پاس جانے سے احتراز کیا۔ اس سرزمین پر ہل چلا دیا گیا اور ارد گرد کھیت بو دیئے گئے''۔

(تاریخ طبری و تاریخ کامل۔ درحالات ۲۳۶ھ)

یہ سرگذشت مسعودی نے ''مروج الذہب'' میں اس طرح بیان کی ہے:-

''۲۳۶ھ میں متوکل نے اپنے ملازم دیزج کو حکم دیا کہ وہ کربلا جائے۔ قبر حسینؑ کو منہدم کردے، زمین کو کھود ڈالے، سارے آثار معدوم کرے اور جس کو بھی وہاں پائے سخت سزا دے۔ دیزج نے بہت کچھ روپے پیسے ان لوگوں کو دینے کا اعلان کیا جو قبر مقدس کا انہدام عمل میں لائیں مگر ہر شخص خوف عقوبت سے پیچھے ہٹ گیا۔ دیزج نے کدال اپنے ہاتھ میں لے کر قبر کے اوپری حصہ کو کھودنا شروع کیا پھر سارے مزدور بھی جٹ گئے۔'' (مروج الذہب مسعودی جلد:۲ ص ۲۰۱-۲۰۲)

ابن خلکان نے بھی مشہور شاعر لیامی کے اس شعر۔

تاللّٰهِ اِنْ كانَتْ بَنِيْ اُمَيَّةَ قَدْ اَتَتْ　　قَتَلَ اِبْنِ بِنْتِ نَبِيِّهَا مَظْلُوماً

(خدا کی قسم اگر بنی امیہ نے اپنے نبی کے نواسہ کو مظلوم قتل کیا)

کی تشریح کرتے ہوئے کچھ یوں قلمبند کیا ہے:۔

''شاعر نے یہ اشعار اس وقت نظم کیے ہیں جب متوکل نے ۲۳۶ھ میں قبر حسینؑ کو منہدم کیا۔ یہ متوکل علیؑ اور اُن کے دونوں فرزندوں حسنؑ و حسینؑ کا سخت ترین دشمن تھا۔ اس نے یہ جگہ یعنی کربلا بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکی، اس کے اردگرد تمام مکانات کھنڈر بنادئے اور حکم دیا کہ اس سرزمین پر کاشتکاری ہو، قبر کو پانی میں ڈبو دیا جائے اور کوئی شخص اُسکے پاس آنے نہ پائے'' (وفیات الاعیان: ابن خلکان جلد: ا ص: ۴۵۵)

ایسی ہی عبارت محمد بن شاکر بن احمد کتبی نے بھی ''فوات الوفیات'' میں لکھی ہے۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:۔

''متوکل نے ۲۳۶ھ میں حکم دیا کہ قبر حسینؑ کو منہدم کردیا جائے اور اس کے گرد و نواح میں جو مکانات ہیں وہ بھی کھنڈر کردئے جائیں اور اس سرزمین پر ہل چلا کر کھیتی کی جائے، اس نے لوگوں کو زیارت کرنے سے ممانعت کردی اور کربلا ایک مدّت تک صحرا بنا رہا۔ یہ متوکل علیؑ کے بغض و شقاوت کی وجہ سے بہت بدنام تھا۔ اس کی اس گھناونی حرکت سے تمام مسلمانوں کو دل مجروح ہوئے۔ اہلِ بغداد نے دیواروں پر گالیاں لکھیں اور شعراء نے اس کی ہجو میں اشعار کہے۔'' (نزہتہ اہل الحرمین ص: ۱۸ سید حسن صدر، مطبوعہ ہند)

علامہ ابوالفداء ۲۳۶ھ کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اسی برس متوکل نے حضرت امام حسینؑ کی قبر منہدم کرنے اور گرد و نواح کے مکانات کو مسمار کرنے کا حکم دیا۔ لوگوں کو وہاں آنے کی ممانعت کردی۔ یہ متوکل علیؑ و اہلبیتؑ سے شدید بغض و عناد رکھتا تھا۔ (تاریخ ابوالفدا: ۲۳۶ھ کے واقعات کے تناظر میں)

مختلف مورخین کی ان شہادتوں سے یہ بات حدِ تواتر تک جا پہنچتی ہے کہ ۲۳۶ھ میں دوسری مرتبہ مشہدِ حضرت امام حسینؑ متوکل کے ہاتھوں منہدم ہوا۔

متوکل کے ہاتھوں ۲۳۷ھ میں قبر حسینؑ کا تیسرا انہدام

جگر گوشۂ رسولؐ کی قبر دوبارا اجاڑنے کے بعد بھی متوکل کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا اور اس نے ۲۳۷ھ میں پھر اس پر یورش کی۔ اس کی نوبت یوں آئی کہ متوکل کو اطلاع ملی کہ اہلِ عراق کربلا میں حائر حسینیؑ کی زیارت کیلئے پھر آتے ہیں اور قبر حسینیؑ پر لوگوں کا جم غفیر ہوتا ہے۔

قبر حسینیؑ کے اس تیسرے انہدام کو بھی اکثر و بیشتر علماء و مورخین نے نقل کیا ہے۔

اس سلسلے میں علامہ تاج الدین عبدالوہاب بن تقی الدین سبکی نے اپنی کتاب ''طبقات الشافعیہ'' جلد:۱، صفحہ:۲۱۶ پر ۲۳۷ ہجری کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ قرمانی کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:-

''متوکل نے حکم دیا کہ قبر حسینؑ کو اجاڑ دیا جائے۔ اس کے گردونواح کے مکانات زمین بوس کردئے جائیں۔ اس سرزمین پر کاشتکاری کی جائے۔ اس نے لوگوں کو زیارتِ حسینؑ کرنے کی ممانعت کی۔ اس ارض پاک پر ہل چلوایا اور ایک عرصہ تک یہ سرزمین صحرا کی طرح اجڑی رہی۔ جس سے تمام مسلمانوں کو دلی قلق ہوئی۔ اہلِ بغداد نے دیواروں اور مسجدوں میں اُسے گالیاں لکھیں۔ دعبلؔ اور دیگر شعراء نے ہجویں لکھیں۔ وہ اشعار جو متوکل کی مخالفت میں کہے گئے ان میں یہ اشعار بھی ہیں۔

تَاللّٰهِ اِنْ كَانَتْ بَنِیْ اُمَيَّةَ قَدْ اَتَتْ   قَتَلَ ابْنِ بِنْتِ نَبِيِّهَا مَظْلُوماً

فَلَقَدْ اَتَاهُ بَنُوْ اَبِيْهِ بِمِثْلِهٖ   هٰذَا لَعُمْرُكَ قَبْرُهٗ مَهْدُوماً

اَسِفُوْا عَلٰى اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا شَارَكُوْا   فِیْ قَتْلِهٖ فَتَتَبَّعُوْا رَمِيْماً

(خدا کی قسم اگر بنی امیہ نے نواسۂ رسولؐ کو ظلم و ستم سے شہید کیا تو ان کے خاندانی رشتہ داروں نے بھی ایسے ہی مصائب ڈھائے۔ یہ حسینؑ کی قبر اجاڑ دی گئی ہے۔ ان (بنی عباس)

کو اس بات کا رنج ہے کہ وہ بھی حسینؑ کے قتل میں کیوں نہیں شریک ہوئے۔ یہ کسر انہوں نے حسینؑ کی ہڈیوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنا کر پوری کی)

متوکل کی یہ حرکت اتنی گھناونی اور قبیح ترین تھی کہ پوری مملکت اسلامیہ میں نفرت اور بیزاری کی لہر ڈور گئی۔ جس نے سنا اس نے اظہارِ نفرین و بیزاری کیا اور متوکل اور اس کے کالے کرتوتوں اور معاندانہ روش کی بھرپور مذمت کی۔

مشہور شاعر علی ابن عباس رومی نے جو ابن رومی کے نام سے معروف ہے نے بنی عباس کی ہجو میں ایک طویل قصیدہ لکھ ڈالا جس میں اس پورے خاندان پر طعن و تشنیع کی، علویوں کا مرثیہ کہا اور متوکل کے قبرِ امام حسینؑ کھود ڈالنے پر اظہار افسوس کیا۔ قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

اَمَامُکَ فَانْظُرْاَیُّ تَھجِیکَ تَنْھَجُ　　طَرِیْقَانِ شَتّیٰ مُسْتَقِیْمٌ وَاَعْوَجُ

تمہارے آگے دو مختلف راستے ہیں، ایک سیدھا اور دوسرا کج اور ٹیڑھا۔ دیکھو کہ تم کون سا راستہ اختیار کرتے ہو۔

آگے چل کر بنی عباس کو خطاب کر کے اور اہلبیت طاہرینؑ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اَفِی الْحَقِّ اَن یُّمْسُوْا خَاصاً وَاَنْتُمْ　　بَکَا وَ اَخُوْ کُمْ بَطْنَہٗ یَتَنَعَجُ

کیا یہ انصاف کی بات ہے کہ اہلبیتؑ بھوکے رہیں اور تم اتنا شکم بھرو کہ پیٹ پھول جائیں۔

وَلِیْدُھُمْ بَادِی الطَّویٰ وَوَلِیْدُکُمْ　　مِنَ الرِّیْفِ رِیَانِ الْعِظَامِ جَذْلَجُ

انؑ کے بچے ضعیف ولاغر اور تمہارے بچے خوشحالی کے سبب مضبوط ہاتھ پیر کے تنومند ہوں۔

تَذَرْدُوْنَھُمْ عَنْ جَوْ ضَھُمْ بِسَلَادِھُمْ　　وَیَشْرَعُ فِیْہِ اِرْتَبِیْلَ وَاَبْلَجَ

تم لوگ اہلبیتؑ ہی کے اسلحوں سے کام لے کر انہیں ان کے حق سے محروم کرتے ہو اور ان کے دشمنوں کے گھر بھرا کرتے ہو۔

وَلَمْ تَقْنَعُوْا حَتّیٰ اِسْتَثَارَتْ قُبُوْرُهُمْ كِلَابُكُمْ مِنْهَا بَهِيْمٌ وَ دِيْزَجُ

تم نے اتنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس حد تک تجاوز کیا کہ تمہارے بہیم اور دیزج جیسے کتوں نے ان کی قبریں کھود ڈالیں۔

ان حالات و واقعات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ متوکل اس بار روضۂ حسینیؑ کو اس قدر اجاڑ نہیں سکا جس طرح کہ اس سے قبل اس نے تاراج کی تھی۔ غالباً اس وجہ سے کہ ایک تو رائے عامہ خلاف ہو جانے کے ڈر سے، دوسرے اس سخت و شدید ٹکراؤ کے خدشے کے پیش نظر جس کا اس کے سپاہیوں کو باشندگان کربلا کی طرف سے سامنا کرنا پڑا، جیسا کہ اکثر مورخین و محدثین نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ شیخ طوسیؒ نے ''امالی'' میں اپنے سلسلۂ اسناد سے قاسم بن احمد بن معمر اسدی کوفی سے جو کہ علمائے سیرت میں سے تھے یہ روایت نقل کی ہے:

''متوکل کو اطلاع ملی کہ اہلِ عراق سرزمین نینوا پر امام حسینؑ کی زیارت کیلئے جمع ہوتے ہیں اور ان گنت لوگ قبر مقدسہ کی زیارت کو جاتے ہیں۔ اس نے اپنے کسی فوجی افسر کو ایک بہت بڑے رسالہ کے ساتھ وہاں روانہ کیا تا کہ قبر حسینیؑ کو منہدم اور لوگوں کو وہاں سے بھگا دے اور کسی کو قبر کے نزدیک نہ آنے دے۔ وہ افسر کربلا کی طرف روانہ ہوا۔ یہ ۲۳۷ھ کا واقعہ ہے، اس نے متوکل کے احکام کی تعمیل کی۔ جس پر عراق والے بپھر گئے اور اس سے کہا ہم لوگ ایک ایک کر کے اپنی جان قربان کریں گے مگر زیارت امام حسینؑ سے باز نہ رہیں گے۔ اس افسر نے متوکل کو یہ سارا ماجرا لکھ بھیجا، متوکل نے حکم بھیجا کہ اہل عراق سے نہ چھیڑو اور کوفہ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ تمہاری روانگی کوفہ والوں ہی کے ضروریات کے تحت ہو رہی ہے پھر تم بغداد واپس آجاو۔ بعد ازاں ۲۴۷ھ تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔''

(امالی شیخ طوسی ص:۲۰۹ بحار الانوار جلد:۱۰ ص۔۲۹۶ ناسخ التواریخ جلد:۶ ص:۴۳۸ تظلم الزہرا ص:۲۱۸،۳۱۷ شرح شافیہ ص:۲۰۸ اعیان الشیعہ: جلد۴ ص ۲۸۷)

سبکی و قرمانی کی روایتوں کے علاوہ اس روایت سے بھی یہ بات واشگاف ہوتی ہے

کہ ۲۳۷ھ میں متوکل کے فوجی افسر نے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے قبر حسینؑ کو منہدم کیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۲۳۶ھ میں جب متوکل نے قبر مبارک کو مسمار کیا تھا تو اس سانحے کے بعد روضہ حسینؑ پھر تعمیر ہو گیا تھا جبھی تو فوجی افسر نے اسے مسمار کیا۔ مگر یہ نہیں پتہ چلتا کہ ۲۳۶ھ میں مسمار کئے جانے کے بعد اتنی جلد وہ روضہ پھر کیسے تعمیر ہو گیا۔ اغلب ہے کہ کربلا کے باشندوں اور عراق کے لوگوں ہی نے متوکل کی سفاکی و درندگی کی پروا کئے بغیر تعمیر کیا ہو گا۔ اس روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ باوجودیکہ متوکل زائرین کو سخت ترین سزائیں دیتا اور اس نے فوجی چوکیوں سے کربلائے معلیٰ کی ناکہ بندی کر رکھی تھی تا کہ کوئی زائر قبر حسینؑ کی زیارت کو نہ آئے پھر بھی لوگ ہر خطرے کو ٹالتے ہوئے جوق در جوق پروانہ وار قبر حسینؑ پر حاضر ہوتے رہے اور وہاں پر اژدحام نظر آجاتا۔ کیونکہ سیدھی سی بات ہے کہ لوگ خالی اور اجڑی زمین کی زیارت تو کرتے نہ ہوں گے بلکہ لازمی طور پر بنی ہوئی قبر کی ہی زیارت کرتے ہوں گے جو اس عرصے میں از سر نو تعمیر کی گئی ہو گی۔

اس سے ایک اور بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ کہ قبر مبارک اور حائر حسینؑ کو بار بار منہدم کرنے میں حکومت کو جتنی لت لگی تھی اُتنا ہی اس کا رعب و داب اور دہشت اب گھٹ گیا تھا اور قوت و اقتدار میں کمی آ گئی تھی اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ ایک فوجی افسر بہت بڑا دستہ لے کر آتا ہے مگر کربلا کے باشندے اور عراق سے آئے ہوئے زائرین اس سے ٹکر لینے پر تیار ہو جاتے ہیں اور افسر کے منہ پر کہہ دیتے ہیں کہ طاقت کا جواب ہم بھی طاقت سے دیں گے۔ ایک ایک کر کے فنا ہوں گے مگر زیارت سے باز نہ آئیں گے۔ بالآخر وہ فوجی افسر اپنے رسالہ سمیت کربلا سے رفو چکر ہو جاتا ہے۔ پھر زید مجنوں نے متوکل اور اسکے کالے کرتوتوں پر جو طعن و تشنیع کی بوچھاڑ شروع کر رکھی تھی اس نے بھی متوکل پر بہت کچھ اثر کیا اور ایک عرصہ تک اس کی ہمت نہ ہوئی کہ قبر مبارک سے کسی قسم کا تعرض کرے۔

متوکل کا چوتھی بار شعبان ۲۴۷ھ میں روضہ حسینیؑ کا انہدام

دس سال تک روضۂ امام حسینؑ متوکل کی گھناونی حرکتوں سے محفوظ رہا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ زید مجنون نے متوکل کے وحشتناک و شرمناک کالے کرتوتوں کا اس طرح ہمہ گیر پیانے پر چرچا کیا اور اس پر طعن و تشنیع کی اتنی بوچھاڑ کی کہ لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور متوکل مجبور ہو گیا کہ زید مجنون جس امر کے خواہشمند ہیں اس کو پورا کیا جائے۔

زید نے متوکل سے خواہش کی کہ حائرِ حسینیؑ کی از سر نو تعمیر کی اجازت دی جائے اور کسی زائر کو چھیڑا نہ جائے۔ بالآخر متوکل نے اس کا فرمان جاری کر دیا۔ زید اس کے پاس سے خوشی خوشی نکلا اور شہر شہر قریہ قریہ گھوم پھر کر اعلان کیا کہ جو شخص بھی امام حسینؑ کی زیارت کو جانا چاہے اس کو ہمیشہ کیلئے امان ہے۔ اسی سبب حائر مقدس متوکل کی حکومت کے آخری دس برسوں میں اس کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہا۔ یہاں تک کہ ۲۴۷ھ میں پھر چوتھی اور آخری بار اُس نے قبر مبارک کو منہدم کر ڈالا جس کی سزا اس کو فوراً مل گئی کہ اس کے بیٹے منتصر نے ترک فوجی افسروں سے ملی بھگت کر کے اس کا کام تمام کر ڈالا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ۲۴۷ھ میں متوکل کو خبر ملی کہ کوفہ و بصرہ سے ان گنت لوگ قبر حسینؑ کی زیارت کے لئے کربلا جاتے ہیں اور بہت بڑی جمعیت وہاں اکٹھا ہو گئی ہے۔ بڑا بازار بھی قائم ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے ایک فوجی افسر کو بہت بڑی لشکر کے ہمراہ وہاں روانہ کیا اور منادی کرادی کہ جو بھی قبر حسینؑ کی زیارت کرے گا حکومت اس کی جان و مال سے بری الذّمہ ہے۔ اس فوجی افسر نے قبر مبارک کھدوا ڈالی۔ زمین کربلا پر ہل چلوا دیا۔ زیارت کیلئے لوگوں کا آنا بند کرا دیا۔ اس کے بعد متوکل نے آل ابو طالبؑ اور شیعان امیر المومنینؑ کو

ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنا شروع کیا مگر اس کے منصوبے کامیاب نہ ہو سکے۔

(بحار الانوار جلد: ۱۰۔ص ۲۴۶ تسلیۃ المجالس شرح شافیہ ابی فراس ص: ۲۰۸ ناسخ التواریخ جلد: ۱ ص: ۲۹۶ نزہتہ اہل الحرمین: ص۔۱۸ اعیان الشیعہ جلد ۴ ص: ۲۸۷ تظلم الزہرا ص: ۲۱۸)

ناسخ التواریخ میں ۲۴۷ھ کی سرگذشت ذرا تفصیل سے مذکور ہے۔ صاحب ناسخ التواریخ ملا سپہر کاشانی لکھتے ہیں:-

''متوکل کو پھر اطلاع ملی کہ اطراف واکناف کے لوگ سرزمین نینوا پر بڑی تعداد میں جمع ہو رہے ہیں۔ روضۂ حسینؑ کے گرد اس طرح طواف کیا جاتا ہے جس طرح خانۂ خدا کا طواف ہوتا ہے۔ قبر مطہر کے قریب بڑے بڑے بازار بھی بن گئے ہیں۔ یہ خبر سُن کر اس کے غیظ وغضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے بہت بڑا فوجی دستہ کربلا روانہ کیا تاکہ حرم مقدس مسمار کر دیا جائے، زمین پر ہل چلا کر کھیتی کی جائے اور اولاد ابی طالبؑ یا شیعان علیؑ میں جو بھی ملے اس کو ہلاک کر ڈالا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے شر کو دور کر دیا کہ وہ اپنے ہی لڑکے منتصر کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارا گیا''۔

شیخ طوسیؒ نے بھی ''امالی'' میں عبداللہ بن رابیۃ الطوری کے حوالے سے اس واقعے کی روئداد مزید صراحت کے ساتھ یوں نقل کیا ہے:-

''عبداللہ بیان کرتا ہے کہ میں نے ۲۴۷ھ میں حج کیا۔ حج سے فارغ ہو کر میں عراق گیا۔ بادشاہ سے ڈرتے ڈرتے میں نے قبر امیر المومنینؑ کی زیارت کی۔ پھر میں کربلا کی طرف زیارت امام حسینؑ کیلئے روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ زمین پر ہل چلایا گیا ہے۔ زمین کربلا پر پانی بھرا ہوا ہے۔ بیل ہل میں جتے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان بیلوں کو زمین پر کھینچا جا رہا ہے اور وہ ہل کھینچتے جا رہے ہیں، مگر جیسے ہی قبر حسینؑ کے قریب پہنچتے ہیں وہ دائیں بائیں مُڑ جاتے ہیں۔ انہیں ڈنڈوں

سے پیٹا جاتا ہے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور قبر مبارک میں کسی طرح ان کے قدم نہیں پڑنے پاتے مجھے زیارت کرنا ممکن نہ ہوا اور میں یہ اشعار پڑھتا ہوا بغداد واپس آ گیا۔

تَا للّٰہِ اِنْ کَانَتْ بَنِیْ اُمَیَّۃَ قَدْ اَتَت قَتَلَ اِبْنِ بِنْتِ نَبِیِّھَا مَظْلُوماً

فَلَقَدْ اَتَاہُ بَنُوْ اَبِیْہِ بِمِثْلِہٖ ھٰذَا لَعُمْرُکَ قَبْرُہٗ مَھْدُوماً

اَسِفُوْا عَلٰی اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا شَارَکُوْا فِیْ قَتْلِہٖ فَتَتَبَّعُوْہُ رَمِیْماً

جب میں بغداد پہنچا تو وہاں ہل چل سی دیکھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے۔ معلوم ہوا کہ متوکل مارا گیا ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں نے دل میں کہا خدا وندا جیسے کو تیسا۔" (امالی شیخ طوسیؒ: ص:۲۰۹ بحار الانوار جلد: ۱۰ ص: ۲۹۶، ۲۹۷ تظلم الزہرا رضی القزوینی۔ ص: ۲۱۸)

متوکل کے بیٹے منتصر نے اپنے باپ کو قتل کرنا جائز سمجھا۔ اس نے ترکی فوجی افسروں سے سازباز کر کے اس کا کام تمام کروا دیا اور ۳ رشوال ۲۴۷ھ یعنی روضہ حسینیؑ کے انہدام کے فوراً ہی بعد اس کا قصہ پاک ہو گیا۔

اس دور میں کربلا میں روضۂ حسینیؑ اور زائرین کے خوف و وحشت کا کیا عالم تھا اور متوکل کی شقاوت و بربریت سے لوگ کتنے ڈرے اور سہمے سہمے تھے۔ علامہ ابو الفرج اصفہانی نے "مقاتل الطالبین" میں محمد بن حسین اشنانی کی زبانی اس کی تصویر کشی کی ہے:۔

"محمد بن حسین بیان کرتا ہے کہ خوف و دہشت کے باعث امام حسینؑ کی زیارت کو گئے کئی سال ہو گئے تھے، پھر میں نے جان کی بازی لگا کر جانے کا ارادہ کر لیا۔ عطاروں میں سے ایک شخص میرے ساتھ آنے کیلئے رضامند ہو گیا۔ ہم بقصد زیارت نکلے، دن کو کہیں چھپ جاتے اور رات کو سفر کرتے۔ یہاں تک کہ ہم لوگ غاضریہ کے نواح میں پہنچ گئے۔ ہم نصف شب کو نکلے۔ ہم نے قبر کی سمت کا پتہ چلانا شروع کیا، یہاں تک کہ ہم قبر پر جا پہنچے، دیکھا کہ قبر اطہر پر جو ضریح رکھی ہوئی تھی اس کو اکھاڑ کر جلا دیا

گیا ہے۔پانی کاٹ کر وہاں لایا گیا ہے۔جس کی وجہ سے زمین دھنس گئی ہے اور خندق جیسی بن گئی ہے۔ہم اس جگہ پر جھک پڑے۔وہاں ایسی خوشبو سونگھی جیسی خوشبو کبھی نہیں سونگھی تھی۔اپنے ساتھی عطار سے پوچھا یہ کیسی خوشبو ہے۔عطار نے کہا خدا کی قسم ایسا عطر میں نے آج تک نہیں سونگھا۔ہم قبر اطہر سے رخصت ہوئے۔قبر کے اردگرد کچھ نشانیاں بنا دیں، جب متوکل مارا گیا تو ہم آلِ ابی طالبؑ اور شیعوں کے ساتھ مل کر پھر اس جگہ پہنچے اور روضۂ مبارک کو پھر پہلے جیسا کر دیا۔" (مقاتل الطالبین۔ص:۲۰۴)

یہ روایت اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ جب بھی قبر مقدسہ منہدم کر دی گئی تو اہلبیتؑ کے جاں نثاروں نے اپنی جان جھوکھوں میں ڈال کر اور پُر آشوب حالات کو نظر انداز کر کے جس طرح بھی ان سے ممکن ہوا فوراً ہی از سرِ نو قبر مبارک درست کی اور روضے کی عمارتیں بھی تعمیر کر دیں۔

اسی سبب حائرِ حسینیؑ متوکل کے دور اقتدار میں، اُس کی بار بار کی غارتگریوں اور یلغاروں کے باوجود کبھی بھی زیادہ دن تک ویران اور کھنڈر نہیں رہا اور نہ ہی ایک لمحہ کے لئے بھی زائرین کے آنے کا سلسلہ رُک گیا۔قبر مطہر کی جگہ جیسا کہ اس روایت سے عیاں ہوتا ہے جانی پہچانی رہی۔زائرین برابر قبر کے پاس اُن علامات اور نشانیوں کی وجہ سے پہنچتے رہے جو زائرین چوری چھپے قبر کے اردگرد بنایا کرتے تھے۔

ایسے ہی پُر اخلاص فدائین اور آل ابی طالبؑ کی مساعی جمیلہ کی بدولت قبر شریف ہمیشہ زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہی۔لاکھوں انقلابات آئے مگر آج تک قبرِ مطہر اپنی جگہ پر باقی ہے۔علاوہ ازیں زائرینِ امام اس خاک کو بخوبی پہچانتے تھے جس میں امام حسینؑ محو آرام ہیں، اس خاک سے ایسی خوشبو آتی کہ قبر کی جگہ اور دوسری جگہ میں آسانی سے تمیز ہو جاتی۔

ان لوگوں کے نام جنہوں نے قبر مبارک کے انہدام وتاراجی میں حصہ لیا

متوکل کے فرمان سے جولوگ روضۂ حضرت امام حسینؑ کے انہدام اورتاراجی میں پیش پیش تھے، مختلف تواریخ میں درج اخبار وروایات کی روشنی میں اُن کے نام یہ ملتے ہیں:

۲۳۳ھ میں ابراھیم دیزج یہودی الاصل اوراسکے رشتہ دار یہودیوں نے قبر مبارک کی زمین کھودی اوروہاں پانی بہالائے۔ (مقاتل الطالبین ص:۲۰۳و۲۰۲شرح شافیہ)

۲۳۶ھ میں بھی اسی دیزج نے یہ گھناونی حرکت پھرانجام دی۔(امالی شیخ طوسی ص:۲۰۷، بحارالانوار علامہ مجلسی جلد:۱۰ ص:۲۹۷)

۲۳۷ھ میں ہارون مغربی یاہارون معری نے ابراھیم دیزج کے ساتھ مل کر یہ روح فرسا کاروائی انجام دی۔

۲۴۷ھ میں کوفہ کے قاضی جعفر بن محمد بن عمار نے یہ شرمناک کام انجام دیا۔جبکہ دیزج اس قاضی کی ماتحتی اورنگرانی میں رہا۔

روضۂ حسینیؑ کا انہدام

۹،۱۰/ذی الحجہ ۲۷۳ھ میں بعہد خلیفہ موٴفق باللہ

متوکل کوموت کے گھاٹ اتارکے اس کا فرزند منتصر ۲۴۷ہجری میں مسند خلافت پر متمکن ہوااورسریرآرا ہوتے ہی اس نے حائرحسینیؑ کوازسرنوتعمیر کرنے اورقبرمطہر کو پختہ کرنے کا فرمان جاری کیا۔اس خلیفہ کوصرف چھ ماہ حکومت کرنے کا موقعہ ملااوراس مختصر مدت ہی میں یہ کام پایۂ تکمیل کوپہنچ گیا جیسا کہ ہم روضۂ حسینیؑ کی تیسری تعمیر کے سلسلہ میں

بیان کر چکے ہیں۔لیکن منتصر کی تعمیر کردہ یہ عمارت ایک چوتھائی صدی سے زیادہ دیر باقی رہ نہیں سکی کیونکہ یہ عمارت موّفق ابن متوکل کے دور میں بالکل ہی ناگہانی اور پُر اسرار طور پر ماہ ذی الحجہ ۲۷۳ھ میں زمین بوس ہوگئی۔

آثار وقرائن سے پتہ چلتا ہے کہ متوکل نے حائر مقدس اور روضۂ حسینیؑ کے متعلق جو وحشیانہ و معاندانہ سیاست روا رکھی تھی اور زائرینِ قبر مقدسہ کو ختم کرنے کی حکمت عملی اپنا رکھی تھی، وہی منفی سیاست اور بہیمانہ پالیسی متوکل کے بعد بھی مدت دراز تک جاری رہی۔فرق صرف اتنا ہوا کہ اس کے رنگ وروپ اور طور طریقے بدلتے رہے۔

بظاہر یہ ناگہانی حادثہ جو تیسری صدی ہجری کے آخر میں پیش آیا، تاریخی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔اس ناگہانی سانحہ سے یہ حقیقت بھی واشگاف ہوتی ہے کہ روضۂ حسینیؑ سے عوام الناس کی والہانہ محبت جتنی بڑھتی جاتی تھی اتنا ہی آئے دن زائرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اور حائر حسینیؑ کا طمطراق، رفعت وعظمت اور تقدس مسلمانوں کے دلوں میں جتنا جاگزیں ہوجاتا اتنا ہی بنی عباس دیکھ دیکھ کر جل بھننے لگتے اور اندر ہی اندر کھول کھول کر رہ جاتے، بالخصوص موّفق جو بالکل اپنے باپ متوکل کا ثانی تھا۔ اگر چہ تواریخ میں اس کے دورِ خلافت میں روضۂ حسینیؑ کے انہدام کا بہت اختصار سے ذکر ہوا ہے، لیکن پس پردہ ان شعائر کی بے حرمتی اور انہدام کے تعلق سے اسکی بھی اپنے باپ جیسی ہی کوششیں رہیں۔اس سلسلے میں بس مندرجہ ذیل ایک روایت ملتی ہے جسے اکثر مورخین، محدثین اور رُوات نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ابوالحسن علی بن الحسن بن الحجاج راوی ہے کہ:۔

''میرے چچیرے بھائی ابوعبداللہ محمد بن عمران بن حجاج کی مجلس میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے،اکابرینِ کوفہ کی ایک جماعت بھی تھی۔عباس بن احمد عباسی بھی وہاں

موجود تھے۔ یہ سب لوگ میرے ابن عم ابوعبداللہ محمد بن عمران بن حجاج کو زندہ بچ جانے پر مبارکباد دینے آئے تھے کیونکہ ذی الحجہ ۲۷۳ھ میں دفعتاً جب روضۂ امام حسینؑ کی چھت گر پڑی تو زائرین کے ہجوم میں محمد بن عمران بھی موجود تھا۔ ان گنت لوگ دب کر مر گئے تھے۔ محض گنتی کے چند لوگوں کی جان بچی۔ ان ہی میں محمد بن عمران کی جان بھی سلامت رہی تھی۔ یہ لوگ بیٹھے باتیں کر ہی رہے تھے کہ اسمٰعیل بن عیسیٰ عباسی آپہنچا۔ اس کو آتے دیکھ کر لوگوں نے دوسری بات چھیڑ دی اور اسماعیل بہت دیر تک بیٹھا۔

(فرحتہ الغریٰ: ابن طاؤس ص: ۶۱، نزہتہ اہل الحرمین ص: ۲۰، تاریخ کربلا معلیٰ ص: ۱۴، اعیان الشیعہ جلد ۲: ص ۵۸، مجالی اللطف ص: ۳۹، بحار الانوار جلد: ۹ ص: ۶۸۹ شرح شافیہ ابوفراس ص: ۳۰۷)

یہ روایت بس اتنے ہی الفاظ پر مشتمل ہے جو مذکورہ بالا تواریخ میں منقول ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کن محرکات اور عوامل کی بنا پر یہ پُراسرار و ناگہانی حادثہ پیش آیا کہ زائرین کے سر پر بیک وقت چھت گر گئی، خاصکر ایسے وقت جبکہ حرم اطہر میں زائرین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا اور مخصوصی کی زیارت ہو رہی تھی، اس کا جواب کتابوں میں سرے سے ہی مفقود ہے اور آج تک اس انہدام کے اسرار سے پردہ نہیں اُٹھ سکا ہے۔ اسی طرح کی اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو آج تک سربستہ اور پُراسرار چلی آ رہی ہیں۔ شاید قیامت کے دن تک یہ نقاب اوڑھے رہیں گے اور انکی پیچیدگی برقرار رہے گی۔

کیا روضۂ مبارک کی چھت قدرتی طور پر خود بخود گر پڑی؟۔ کیا حکومت کی سیاسی بازی گری کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں رہا؟ یا یہ کہ یہ حکومت کی سازشی ہتھکنڈوں کا نتیجہ تھا؟ جیسا کہ منصور، ہارون اور متوکل کے ادوار میں اعلانیہ طور اس نوع کے حادثے پیش آچکے تھے۔

منصور و ہارون اور متوکل نے تو کھلم کھلا روضۂ اطہر کو منہدم کیا۔ زائرین کو اس کا موقعہ ملا کہ وہاں سے دور ہٹ کر اپنی جانیں بچالیں۔ موفق کے دور کا یہ انتہائی ہولناک

انہدام پُراسرار طور اچانک وقوع پذیر ہوا۔ وہ بھی مخصوص کی زیارت کے دوران جبکہ زائرین کا ایک بے پناہ اژدحام تھا، حرم حسینیؑ میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، لوگ زیارات، نماز و دعا میں مصروف تھے کہ ناگہاں پوری چھت زمین پر آگری۔ اسی وجہ سے اس میں شک وشبہات اور خدشات کی کافی گنجائش موجود ہے کہ شاید چھت اپنے آپ نہیں گری۔

یہ فرض کرنا انتہائی مشکل ہے کہ عمارت کی بنیادوں میں کوئی خامی رہ گئی ہوگی کہ جس کی وجہ سے چھت اپنے آپ گر پڑی۔ اس لئے کہ وہ عمارت پرانی یا بوسیدہ نہیں تھی۔ اس عمارت کو بنے ہوئے مشکل سے پچیس برس ہو گئے تھے۔ کس فرد کی عقل یہ بات تسلیم کرے کہ محض پچیس برس کی تعمیر شدہ پختہ عمارت دفعتاً خود بخود گر پڑے۔

ضبہ بن محمد اسدی کے ہاتھوں

۳۶۹ھ میں حائر حسینیؑ کی تاراجی

جس طرح منصور دوانقی، ہارون رشید اور متوکل کے ہاتھوں روضۂ حسینیؑ منہدم ہوا اور اس کا بیش بہا مال واسباب، موقوفات اور خزائن لوٹ لئے گئے۔ بایں ہمہ ان تینوں خلفاءؑ سے پہلے بھی کئی بار حرم حسینیؑ تاراج اور لوٹ کھسوٹ کا شکار ہوا اور ان کے بعد میں بھی۔ ۳۶۹ ہجری میں قبیلہ بنی اسد کے ایک ڈاکو ضبہ بن محمد اسدی نے بھی اس روضۂ مقدس کا تمام مال ومتاع اور خزانے لوٹ لئے۔ اس ضبہ بن محمد نے چوروں اور ڈاکوؤں کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کر رکھی تھی۔ اُس نے عین التمر کو اپنا مرکز بنا کر چاروں طرف لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ وہ آنے جانے والے قافلوں کو لوٹ لیتا اور شہروں پر ڈاکہ مارتا، یہ طائع اللہ عباسی کا دورِ خلافت تھا اور پوری

مملکت اسلامیہ کا امن وامان درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ سلطان عضد الدولہ بویہی نے اسی سال ایک فوجی دستہ اس کی سرکوبی کے لئے عین التمر روانہ کیا۔ ضبہ بن محمد کو پتہ بھی چلنے نہ پایا کہ فوجی دستے نے اسے اپنے محاصرے میں لے لیا اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ وہ اپنے اہل وعیال اور مال واسباب کو خیر باد کہہ کر فرار ہو جائے اور عضد الدولہ کے سپاہیوں سے اپنی جان بچائے۔

بہر حال اس ڈاکوؤں کے گروہ نے حرم حسینیؑ میں جو لوٹ کھسوٹ کی تھی بالآخر اُس کا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑا، علامہ ابن اثیر نے ۳۶۹ھ ہجری کے واقعات کے سلسلے میں کچھ اس طرح اپنی تاریخ میں اس واقعے کی سرگذشت قلمبند کی ہے:۔

”اسی ۳۶۹ھ ہجری میں عضد الدولہ نے عین التمر ایک دستہ فوجی روانہ کیا جہاں ضبہ بن محمد اسدی نے تباہی مچا رکھی تھی، اُس نے چوروں، ڈاکوؤں کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ اُسے پتہ بھی چلنے نہ پایا کہ فوجی دستہ نے اُسے اپنے حصار میں لے لیا۔ اُس نے اپنے اہل وعیال، مال ومتاع، سب کو چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کیا۔ اس کا مال وجائداد ضبط کر لیا گیا۔ اس کے اہل وعیال قید کر لئے گئے اور عین التمر علاقے پر حکومت نے پوری طرح گرفت حاصل کر لی۔

اس سے پہلے وہ روضۂ حسینیؑ کو لوٹ چکا تھا جس کے نتیجے میں اسے یہ سزا ملی۔“

(تاریخ کامل جلد: ۸ ص۔ ۲۳۶ درحالات ۳۶۹ھ)

یہ مختصر حال اس ڈکیتی اور حرم حسینیؑ کی تاراجی کا ہے جو ۳۶۹ھ میں ضبہ ابن محمد اسدی کے ہاتھوں ہوئی لیکن کسی اور کتاب سے اس حادثہ کی مزید تفصیل نہیں مل سکی۔

یہ بھی سربستہ راز ہے کہ اس نے حائر حسینیؑ اور اُس کے خزانہ کی کیا کیا چیزیں لوٹی۔ البتہ واقعات کی کڑیوں کو ملا کر دیکھنے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ

معاملہ صرف لوٹ مار ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ حائر حسینیؑ کی عمارت کو بھی نقصان پہنچایا گیا۔ جس کی وجہ سے پھر اسی برس یعنی ۳۶۹ھ ہجری میں عضد الدولہ فنا خسرو بن رکن الدولہ بویہی کے ہاتھوں روضۂ حسینیؑ کی از سر نو تعمیر و تجدید عمل میں آئی۔

جیسا کہ ہم روضۂ حسینیؑ کی پانچویں تعمیر کے سلسلہ میں لکھ چکے ہیں اور علامۂ ابن اثیر نے بھی ۳۶۹ھ کے واقعات کے ضمن ان جملوں میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

''عضد الدولہ نے بغداد سے مکہ تک کے راستے کی اصلاح و مرمت کی۔ مکہ و مدینہ میں آباد شرفائ اور اکابرین کو روپے پیسے دیے۔ ویسا ہی برتاؤ اس نے نجف اشرف اور مشہد حسینیؑ کے ساتھ بھی کیا۔'' (تاریخ کامل۔ جلد: ۸ ص: ۲۲۴)

غالباً اسی وقت عضد الدولہ نے روضۂ حسینیؑ کی تعمیر و مرمت کرائی ہوگی کیونکہ ضبہ بن محمد اسدی اور اس کی ٹولی کی لوٹ مار اور نقصان کی وجہ سے تعمیر ناگزیر ہوگئی ہوگی۔

روضۂ حسینی کا انہدام اور آتشزدگی

۴۰۷ء میں، بعہدِ قادر باللہ عباسی

قادر باللہ عباسی کے دورِ خلافت میں پوری مملکت اسلامیہ کے اطراف و اکناف میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکی ہوئی تھی، اسی پاداش میں حرم حسینیؑ بھی ماہ ربیع الاول ۴۰۷ھ میں خاکستر ہوا۔ آگ پہلے روضۂ اطہر میں لگی پھر پھیل کر رواق تک جا پہنچی، پھر گنبد نذر آتش ہوا اور نصف شب تک پوری عمارت راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوئی۔ باہری چار دیواری اور حرم کے کچھ چیزوں کے سوا کچھ بھی نہیں بچا۔

آتشزدگی کے اس بھیانک واردات کو ابو الفرج ابن جوزی نے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے اور ابن اثیر نے بھی اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ ابن جوزی کی عبارت یہ ہے:

"ماہ ربیع الاول ۴۰۷ھ میں روضۂ امام حسینؑ اور رواق جل گئے۔اس کا سبب یہ ہوا کہ خادموں نے دو بہت بڑی شمعیں جلا رکھی تھیں۔آدھی رات کو دونوں شمعیں گر پڑیں۔اُنہوں نے قبر کے کٹہرے کو جلا دیا اور پھر آگ ہر سمت پھیل گئی۔"

(المنتظم ابن جوزی جلد:۷ ص:۲۸۲)

اسی قسم کی عبارت ابن اثیر نے بھی "تاریخ کامل جلد:۹،ص:۱۰۲" پر رقم کی ہے۔ بظاہر دونوں کی عبارتوں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ واردات خود بخود پیش آئی اور اس کے در پردہ کوئی سازش کارفرما نہ تھی، لیکن قادر باللہ عباسی کے دور میں جس طرح پوری مملکت اسلامیہ میں شورش وافراتفری بپا تھی، پھر اس خاندان بنی عباس کے جو عام رجحانات و میلانات رہے کہ مسلمانوں کو آزادئ فکر سے محروم کیا جاتا تھا، معتزلہ کے نظریات وافکار کُچلے جا رہے تھے اور ان کے ہم مسلک وہم خیال افراد کو کافر قرار دیا جا رہا تھا۔اسی طرح بنی فاطمہؑ کو کافر کہا جاتا، ان پر طعن وتشنیع کی جاتی اور نام نہاد درباری علماء[1] وفقہا سے اُن کے خلاف فتوے حاصل کر کے مسلمانوں کے ہر طبقہ کو ان کا دشمن اور اُن کے خون کا پیاسا بنایا جا رہا تھا۔ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھکر اس آتشزدگی کے حقیقی اسباب کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔خاصکر جب ہم اُن قتل وغارتگری کے واقعات پر نظر دوڑاتے ہیں جن کا سلسلہ محرم ہی کے ابتدائی تاریخوں سے شروع ہو گیا تھا یعنی حائر حسینیؑ کی آتشزدگی کے دو تین مہینے پہلے، نیز وہ ہنگامے جو اسی سال افریقہ میں معز ابن بادیس کے دور میں وقوع پذیر ہوئے جن میں مسلمانوں ہی نے مسلمانوں کو تہہِ تیغ کیا اور افریقہ کے گوشے گوشے میں[2] چن چن کر شیعوں کا قتل عام کیا گیا، ان کا مال ومتاع لوٹا گیا، پھر اسی سے منسلک اندرون ملک کے وہ ہنگامے جو حرم حسینیؑ کی آتشزدگی کے دس دن بعد فوراً شروع ہو گئے جنہیں ابن جوزی اور ابن اثیر وغیرہ سب ہی نے ورطۂ تحریر میں لایا ہے:-

۱: تاریخ العرب سید امیر علی ص:۲۶۳:مطبوعہ مصر ۲:تاریخ کامل جلد:۹ص:۱۲۲: واقعات محرم ۴۰۷ھ

''اسی ماہ ربیع الاول میں شہر واسطہ کے شیعوں اور سنیوں کے درمیان فساد پھوٹ پڑا۔ واسطہ میں شیعوں اور زیدیوں کے محلے لوٹ لئے گئے، انھیں آگ لگا دیا گیا اور معززین شیعہ اور سادات علوئین، بھاگ کر علی ابن مزید کے پاس مدد مانگنے پہنچے۔''

کیا یہ تعجب خیز اور شک آور بات نہیں کہ یہ تمام قتل و غارتگری، تاراجی ولوٹ کھسوٹ کے واقعات افریقہ میں بھی اور افریقہ ہی کی طرح واسطہ میں قادر باللہ عباسی جس کی اہلبیتؑ سے بغض و عناد الم نشرح تھی، کے دور میں بیک وقت ایک ہی مہینہ کے اندر برپا ہوں۔

مگر ان سب کے باوجود حرم حسینیؑ کی اس آتشزنی کے متعلق دعوا کیا جاتا ہے کہ یہ بلا سبب خود بخود نمودار ہوئی۔ حالانکہ اسی قسم کی آتشزدگی کے واقعات ٹھیک اسی دور میں دوسرے مقدس مقامات پر بھی واقع ہوئے۔ حرم حسینیؑ کی آتشزدگی کے ٹھیک دس دن بعد روضہ سامرا میں آگ لگ گئی۔ اسی دوران بغداد کے کرخ محلہ میں جہاں کی تمام تر آبادی شیعوں پر مشتمل تھی پھونک دی گئی۔ حد تو یہ ہے کہ قادر باللہ کی بداعمالیوں سے مسجد الحرام، مسجد نبوی اور بیت المقدس بھی محفوظ نہیں رہ سکا کیونکہ جس دن مسجد الحرام کا رکن یمانی جلا مسجد نبوی کے سامنے کی دیوار گری۔ اسی دن بیت المقدس کا بہت بڑا بھی گنبد گر پڑا۔

(المنتظم جلد:۷ ص:۲۸۳ تاریخ کامل جلد:۹ ص:۱۲۲)

مطلب پہلے افریقہ میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑکی۔ وہاں شیعوں کا قتل عام ہوا۔ پھر حرم حسینیؑ میں آگ لگی۔ سامرا کا روضہ نذر آتش ہوا۔ بغداد میں محلہ کرخ کو جلا دیا گیا۔ بیت الحرم کا رکن یمانی خاکستر ہوا۔ گو کہ بیک وقت مملکت اسلامیہ کے اطراف و اکناف میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑک اُٹھی اور ہر طرف خوف و دہشت کا دور دورہ اور ہو کا عالم تھا۔

بہر حال اپنے طویل عہد حکومت کے بیالیسویں برس اس قادر باللہ نے تمام اسلامی شہروں میں ہیبتناک شیطانی چکر چلایا۔ جگہ جگہ آگ لگی، خونریزی ہوئی اور مکانات اور شہر

اجڑ گئے حتیٰ کہ اماکن مقدسہ بھی نہیں بچے۔ ہر طبقہ اور ہر مکتبہ فکر کے مسلمان مصیبت میں پھنسے اور جو کچھ ہوا وہ درباری ملاؤں کی تائید اور اُن کے فتوؤں کی ایما پر رونما ہوا۔ درندگی اور شقاوت میں یہ خلیفہ عرب کے نیرو یعنی متوکل پر بھی بازی لے گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری دور یعنی ماہ ذی الحجہ ۳۸۹ھ اور محرم ۳۹۰ھ میں مختلف مسلم فرقوں کے درمیان جس فتنہ وفساد کی تخم ریزی کی، اس کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی اور ۴۲۲ھ میں پوری طرح بھڑک اُٹھی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بغداد کے محلّہ باب البصرہ کے سنیوں نے قم کی ایک جماعت کو جو روضۂ حسینیؑ کی زیارت کو جا رہے تھے، کربلا جانے سے روک دیا۔ اُن کے تین آدمی مار ڈالے اور کاظمین میں امام موسیٰ کاظمؑ کی زیارت ہی کرنے نہیں دی۔

مگر ادھر تو عباسی خلیفہ قادر باللہ آتشزنی کی پالیسی پر کاربند تھا لیکن دوسری طرف اسلامی ممالک کے مشرقی حصے میں اس کے برعکس عمل ہو رہا تھا۔ ۴۲۱ھ میں سلطان محمود غزنوی نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کا روضہ بڑے تزک واحتشام اور شاندار اہتمام سے تعمیر کرایا جو صوبہ خراسان کے شہر طوس میں واقع ہے۔ اس نے ایسے اسباب ووسائل فراہم کئے کہ زائرین کی ہمت بندھ گئی اور وہ کثیر تعداد میں جوق در جوق زیارت کو آنے لگے۔ اس نے اپنی مملکت میں عام منادی کرادی کہ کسی زائر کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ اس سلسلے میں ابن اثیر ۴۲۱ھ کے واقعات کے ذیل میں یوں خامہ فرسا ہے:۔

"یمین الدولہ محمود بن سبکتگین غزنی کے بادشاہ نے اسی سال امام رضاؑ کے روضے کو از سر نو تعمیر کرایا اور انتہائی شاندار عمارت تعمیر کی۔ اس روضے کو اس کا باپ سبکتگین اجاڑ چکا تھا۔ طوس کے لوگ زائرین کو بھی گوناگوں اذیتیں پہنچایا کرتے۔ سلطان محمود نے اس کی سختی سے روک تھام کر دی۔ اس کے ایسا کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے خواب میں امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کو دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں یہ سب کب

تک ہوتا رہے گا؟ محمود کو یقین ہو گیا کہ امیر المومنینؑ کی خواہش ہے کہ مشہد مقدس کی تعمیر ہو جائے چنانچہ اس نے تعمیر کا فرمان جاری کیا۔" (تاریخ کامل جلد:۹ ص:۱۳۹)

چونکہ مملکت اسلامیہ کے حالات بہت ہی کشیدہ ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی مابین آپسی رنجش، رسہ کشی، ٹکراو اور فتنہ و فساد عروج پر تھے۔ مقدس مقامات کو منہدم کرنے، حرم حسینیؑ اور حرم سامرا میں آگ لگانے کی سازشی کاروائیوں کی وجہ سے اسلامی ممالک میں امن و امان غارت ہو کر رہ گیا تھا جس کے پیش نظر چار و نا چار منصب وزارت ابن سہلان رام ہرمزی کے حوالہ کیا گیا تا کہ حالات پر سکون ہوں، امن و امان قائم ہو اور لوگوں کے دلوں کو اطمینان نصیب ہو۔ چنانچہ ان حادثات کے فوراً ہی بعد جن کا سلسلہ محرم سے ربیع الاوّل تک جاری رہا تھا، ماہ ربیع الثانی میں منصب وزارت پر اس کا تقرر ہوا۔ ابنِ جوزی لکھتے ہیں کہ جونہی سلطان الدولہ کی طرف سے ابو محمد حسن بن فضل رام ہرمزی نے خلعت وزارت زیب تن کی تو اوّلین فرصت میں ہی اُس نے حائر حسینیؑ کی فصیل تعمیر کرائی۔ (المنتظم ابن جوزی جلد:۷۔ص:۲۸۲)

۵۲۶ھ میں مسترشد باللہ عباسی کے ہاتھوں حائر حسینیؑ کے خزانہ اور مال و اسباب کی تاراجی

ایک مدت تک حائر حسینیؑ کی تاخت و تاراجی، آتش زدگی اور قبر حسینیؑ کو کدال پھاوڑے سے کھود ڈالنے کی پالیسی ساقط رہی۔ پانچویں صدی ہجری تک حائر حسینیؑ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، البتہ اس کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کو نقصان پہنچانے کی شعوری کوشش کی گئی۔ جب بھی موقعہ ملا اس کا مال و متاع لوٹ لیا گیا، خزائن اور موقوفات ضبط کر لئے گئے۔ اس کے فرش و فروش، قیمتی پردے، سونے

کی مرصع قندیلیں، چراغ، بیش بہا نوادرات جو زائرین نے اس روضے کی نذر کئے تھے، قیمتی اور نفیس اشیاء جو عقیدتمندوں نے اس روضہ پر چڑھائی تھیں وہ یکسر لوٹ لئے گئے۔ مسترشد باللہ عباسی نے چھٹی صدی ہجری کے شروع میں روضۂ حسینیؑ کے حوالے یہی لوٹ کھسوٹ کی پالیسی اپنائی تھی۔ علامہ مجلسی ''بحارالانوار'' میں ''مناقب ابن شہر آشوب'' سے نقل کرتے ہوئے خامہ فرسا ہیں:

''مسترشد نے حائر حسینیؑ اور کربلا کا سارا مال واسباب لوٹ لیا اور کہا قبر کو اس خزانے کی کیا احتیاج ہے۔ اُس نے یہ مال واسباب اپنے لشکر پر خرچ کیا مگر جلد ہی وہ اور اُس کا بیٹا راشد دونوں مارڈالے گئے۔'' (بحارالانوار جلد: ۱۰۔ ص: ۲۹۷)

مسترشد کی دورِ خلافت میں شیعانِ اہلبیتؑ یہ سُن کر بہت ہی افسردہ طبع ہوئے کہ مسترشد نے روضۂ حسینیؑ کا سارا خزانہ، مال ومتاع، قیمتی جواہرات لوٹکر اپنے لشکر پر یہ کہہ کر خرچ کرڈالے کہ قبر کو خزانہ کی کیا ضرورت؟ البتہ اس نے روضہ اور حائر کی عمارت سے کوئی تعرّض نہیں کیا۔ مسترشد نے اس دور میں بڑے پیمانے پر فوجی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں، کیونکہ اپنے آخری عہدِ خلافت میں اسے داخلی شورشوں اور خانہ جنگی کا خاصا سامنا تھا جو سلطان محمود کے ۵۲۸ھ میں انتقال کے بعد ہی پھوٹ پڑی تھی۔ اسے مال ودولت کی شدید احتیاج تھی اسی لئے اس نے حائر مقدس کو تاکا اور اسکی ساری دولت ہتھیا کر اپنی حکومت و اقتدار کو استحکام بخشنے میں صرف کی۔ نیز ان لڑائیوں پر خرچ کی جو سلجوق شاہ کے بھائی مسعود نے ۵۲۶ھ کے اواخر میں اسکے خلاف چھیڑ رکھی تھیں۔ دونوں میں گھمسان کا معرکہ ہوا۔ مسترشد کو شکست فاش ہوئی اور دشمن نے اُسے قید کرلیا۔ وہ اپنے خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ فرقہ باطنیہ کی ایک جماعت خیمہ میں گھس آئی اور اس کا کام تمام کیا۔ (تاریخ العرب سید امیر علی ص:۲۹۱) یوں حائر حسینیؑ لوٹنے کی سزا اُسے بہت جلد ہی مل گئی اور جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

مشعشعین کے ہاتھوں ۸۵۸ھ میں حائر حسینیؑ کی تاراجی

دوسری اور تیسری صدی ہجری کے دلدوز سانحات نیز ۴۰۷ھ میں قادر باللہ عباسی کی بداعمالیوں کے سبب حائر حسینیؑ کی ہولناک آتشزدگی، پھر ۵۲۶ھ میں مسترشد باللہ عباسی کی لوٹ کھسوٹ کے بعد تقریباً ساڑھے چار سو برسوں تک حائر حسینیؑ بظاہر محفوظ و مامون رہا۔ کسی نے حرم حسینیؑ کے ساتھ دست درازی نہیں کی، نہ اسکی بے حرمتی ہوئی اور نہ ہی یہ حقیر سیاسی اغراض ومقاصد کی بھینٹ چڑھا بلکہ اس کے برعکس اس مدّت مدید میں عالم اسلام میں اس نے اپنی رفعت وعظمت اور شہرت ومقبولیت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ شاہان وسلاطین نے بھی اس کی تعظیم وتکریم میں غیر معمولی جوش وعقیدت کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ نویں صدی ہجری کے وسط میں علی بن فلاح المعروف بہ مشعشعی کے ہاتھوں اس روضۂ مبارک کو پھر تاخت وتاراجی مقدر ہوئی۔

نویں صدی ہجری کے آغاز میں جنوبی عراق میں ایک نئی عرب حکومت تشکیل پائی، دھیرے دھیرے اس حکومت کا دائرہ بڑھتا گیا اور بہت سے صوبے اس کے زیر نگین آئے۔ حویزہ، اہواز، الجزائر، خوزستان کا ایک حصہ، سبھی پر اس حکومت کا قبضہ ہوگیا۔ دوسو اکیس سال کے طویل عرصے تک یعنی ۸۰۴ھ سے ۱۰۲۵ھ تک یہ حکومت قائم رہی۔ فلاح بن محمد آل مشعشع (المتوفی ۸۵۴ھ) نے اس حکومت کی داغ بیل رکھی تھی۔ آخری دور میں یہ حکومت بے حد کمزور ہوگئی اور ان کی حیثیت محض شاہان صفویہ کے گورنر کی رہ گئی۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ آل مشعشع سادات تھے لیکن اس کی صحت ثابت نہیں کیونکہ مورخین نے ان کے نسب میں بہت شدت سے اختلاف کیا ہے۔

یہ آل مشعشع دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک طبقہ غالیوں کا تھا، دوسرا دعویداران تشیع تھا۔ ان کا پہلا بادشاہ فلاح تھا جس نے خویزہ میں بادشاہت قائم کی۔ بچپن ہی میں اس کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا تھا پھر شیخ احمد بن فہد حلیؒ نے اس کی ماں سے شادی کر لی اور اسی نے فلاح کی پرورش کی۔ فلاح ۸۵۴ھ میں مر گیا۔

اس فلاح کا بیٹا محمد، شیخ احمد ابن فہد حلیؒ کا شاگرد تھا اس نے پڑھ لکھ کر غلط اور بالکل بے بنیاد باتوں کا دعویٰ کیا، شیخ احمد بن فہدؒ نے اس کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا اور امیر منصور بن قیان بن ادریس عبادی کو خط لکھا کہ اس شخص کا خون جائز ہے۔ منصور نے اس کو گرفتار کر کے قتل کرنا چاہا مگر وہ مکر و فریب سے کام لے کر نو دو گیارہ ہوا۔ پھر اس کی نصیب خوب چمک اُٹھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں عربوں کے بہت سے جتھے اس کے ساتھ مل گئے۔ سب سے پہلے قبیلہ بنو سلامہ نے اس کی بیعت کی جس کو اس نے نیک شگون اور خیر و برکت کی علامت سمجھا اور اس کے بعد اس نے خوزستان کے مختلف شہروں پر اپنا اقتدار جما لیا اور بڑے بڑے ہولناک اقدامات کئے اور بے شمار لڑائیاں لڑیں۔ (مجالس المومنین ص: ۴۰۴)

اس کے سیاہ ترین کارناموں میں نجف اشرف پر حملہ ہے۔ اس حملہ کے دوران اُس نے امیر المومنینؑ کے قبہ کو نذر آتش کیا اور چھ مہینے تک اُسے اپنا باورچی خانہ بنائے رکھا جیسا کہ علامہ ضامن ابن شدقم نے "تحفتہ الازہار" سے یوں نقل کیا ہے :-

"محمد ابن فلاح تمام اہواز پر قابض ہو گیا، شاطی فرات سے لے کر حلہ تک۔ یہ مذہب میں بڑا غالی تھا۔ پھر عراق کی طرف بڑھا اور اس پتھر کو جلا دیا جو قبہ امیر المومنینؑ کو احاطہ کئے ہوئے تھا اور قبہ مبارک کو چھ مہینہ تک باورچی بنائے رکھا۔ اس کا دعوا تھا کہ اِنَّہٗ رَبٌّ وَالرَّبُّ لَا یَمُوْتُ "یہ علیؑ خدا ہیں اور خدا کو موت نہیں آتی"۔ (آثار الشیعہ ص: ۵۸، ۵۹)

اس نے رجب ۸۴۴ھ میں خروج کیا تھا اور ۸۶۶ھ یا ۸۷۰ھ میں انتقال کیا۔

علی بن محمد بن فلاح کی غارتگری
اور اس کے ہاتھوں حائرِ حسینیؑ کی تاراجی

محمد بن فلاح کا بیٹا علی بن محمد بن فلاح نے اپنے باپ کی زندگی ہی میں زمامِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی اور اپنی قوم کا سردار بن بیٹھا تھا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت امیر المومنینؑ زندہ ہیں اور آپ کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے۔ اس نے اپنے لشکر کے ذریعے عراق پر چھاپے مارے۔ مشاہد مشرفہ کو لوٹ لیا اور عتبات عالیات کی بے حرمتی کی۔ اس کا باپ اُس کی اصلاح و تادیب کرنے سے قاصر رہا۔ جب بھی امراء اور روسأ اس کے سیاہ کرتوتوں کی شکایت اس کے باپ سے کرتے تو وہ اپنی بے بسی اور لاچاری کا اظہار کرتا۔ اس علی بن محمد کی بعض تالیفات سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے مہدویت کا دعویٰ بھی کیا۔ اُس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے دو قدم آگے بڑھکر دعوائے الوہیت بھی کر ڈالا۔ (مجالس المومنین قاضی نور اللہ شوشتریؒ ص: ۲۰۵)

یہ علی بن محمد بن فلاح 'مولا علی' (یعنی علی کے غلام) کے نام سے مشہور تھا۔ سیاہکاریوں اور قہر سامانیوں میں من و عن اپنے باپ کے نقش و قدم پر گامزن تھا۔ یہ انتہائی شقی القلب اور درندہ صفت تھا۔ اس کی بے حیائی اور بے شرمی اس حد تک پہنچی کہ اس نے اپنے باپ ہی کے باطل دعوؤں پر اکتفا نہیں کی بلکہ الوہیت تک کا دعویٰ کر ڈالا۔ اس نے ۸۵۸ھ میں اُن زائرین کو جو نجف کی زیارت کو گئے ہوئے تھے قتل کر ڈالا اور ان کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا۔ اپنے باپ کی زندگی کے آخری دور میں اس نے اُس کو بھی بے بس کر کے حکومت کے تمام امور اپنے ہاتھ میں لے لئے اور غالیوں کا خود سردار بن بیٹھا۔ عراق کے مشاہد مشرفہ پر حملے کئے اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا۔ جو کچھ عتبات عالیات میں پالیا وہ لوٹ

لیا اور شرمناک شقاوت قلبی کا مظاہرہ کیا۔ (شہداء الفضیلہ علامہ امینی ص:۳۰۵)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مشعشی، علی ابن محمد بن فلاح کے القاب میں سے ہے جو الجزائر اور بصرہ کا حاکم تھا، جس نے مشہد حسینیؑ اور روضہ نجف اشرف کو لوٹ کر ان دونوں مشاہد مشرفہ کے باشندوں کا انتہائی بہیمانہ قتل عام کیا اور باقی لوگوں کو قید کر کے اپنی دار السلطنت بصرہ و الجزائر لے گیا۔ یہ سانحات ۸۵۸ھ میں رو بعمل آئے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ اِن گمراہ مشعشیہ کا ایک گروہ تلوار کھا جاتا تھا۔ چنانچہ "ریاض العلماء" میں مذکور ہے کہ ان کی جماعت کا ایک شخص ہمارے بادشاہ کے پاس آیا اور بادشاہ کے مصاحبین اور حاشیہ نشینوں کے سامنے تلوار کھا گیا۔ مگر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

(روضات الجنان ص:۲۶۵۔۳۵۳)

علی ابن محمد ابن فلاح اپنی اسی روش پر باقی رہا یہاں تک کہ ۸۶۱ھ میں قلعہ بہبہان کے محاصرے کے دوران ایک تیر اس کو آ کر لگا اور اس کو موت نے آ دبوچا۔ حائر مقدس کے ساتھ اس نے جو زیادتیاں کی تھیں تین ہی برس میں اس کو اس کی سزا مل گئی۔

ان مذکورہ حادثات سے حاصل تجربے اور ان کے غیر معمولی نتائج

ہم نے ان بدکار و بد طینت غالیوں کے کرتوتوں کو جو محض مکر و فریب اور تہمت و بہتان سے کام لیکر سیّد ہونے کا ڈھونگ رچاتے تھے، اسلئے صراحت سے بیان کیا تا کہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ اس دور میں اسلامی ممالک کے اندر کیسی طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر سو کیسی اندھیر نگری غالب تھی۔ محمد بن فلاح نے نجف اشرف کی کس طرح بے حرمتی کی اور اس کے لڑکے علی محمد بن فلاح نے کربلا میں کیونکر قیامت ڈھائی۔ علی بن

محمد کے کالے کرتوتوں کی اگرچہ ہمیں اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہوسکی کہ اس نے بھی ضبہ بن محمد اسدی کی طرح حائر حسینی کو تاخت وتاراج کیا۔ زائرین اور کربلا کے باشندوں کی کثیر تعداد کو قتل کیا، بچے کھچے لوگ قید کر کے اپنی دارالسلطنت الجزائر اور بصرہ لے گیا۔
لیکن آثار وقرائن سے اتنا تو ہم اخذ کر ہی سکتے ہیں کہ علی بن محمد بن فلاح کے عہد میں حائر مقدس کو حد سے زیادہ نقصان پہنچا۔ اتنا نقصان ۵۲۶ھ میں بھی نہیں پہنچا تھا، کیونکہ حائر مقدس مسترشد کی غارتگری کے بعد سے ۸۵۸ھ تک بالکل محفوظ ومامون رہا تھا۔ اس مدت میں عمارات کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ ہو چکا تھا۔ اوقاف کی تعداد بھی کافی حد تک بڑھ چکی تھی۔ آخری عباسی خلفاء اور دیگر سلاطین وحکام نے قیمتی تحائف اور انمول نوادرات سے عتبات عالیات کے خزائن بھر دیے تھے۔ خاصکر عباسی خلیفہ احمد ناصر، نیز شیعہ سلاطین جیسے محمود غازاں (۶۹۴ھ تا ۷۰۳ھ)، شاہ محمد خدابندہ (۷۰۳ھ تا ۷۱۶ھ) اور اس کے بیٹے بہادر خان ابوسعید (۷۱۶ھ تا ۷۳۶ھ)، پھر سلطان اویس الجلائری (۷۵۷ھ تا ۷۷۵ھ) اور اُس کے بیٹوں سلطان حسین (۷۷۵ھ تا ۷۸۴ھ) اور سلطان احمد (۷۸۴ھ تا ۸۰۵ھ) نے بے شمار تحائف وہدایا حرم اقدس کی نذر کئے تھے۔ ان تینوں جلائری سلاطین نے حائر مقدس کے لئے بہت عظیم الشان آثار چھوڑے تھے۔

اسی طرح شاہان قراقویونیہ میں قرا یوسف (۸۱۵ھ۔۸۲۷ھ)، اس کے بیٹے اسکندر (۸۲۷ھ۔۸۴۰ھ)، میرزا جہاں شاہ (۸۴۰ھ۔۸۷۲ھ) اور اس کے فرزند حسین علی شاہ (۸۷۲ھ۔۸۷۳ھ) بھی ان مذکورہ بالا سلاطین سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے بھی عتبات عالیات کی خدمت کرنے اور ان کی رونق وشان بڑھانے میں حد سے زیادہ کردار ادا کیا۔ یہی وجہ تھی کہ نویں صدی ہجری میں حائر مقدس کی عظمت و جلالت اور شان ووقار اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ جس کا اندازہ کرنا محال ہے۔ اس کے

خزائن تحائف وہدایا اور بیش بہا نقد وزر اور نوادرات سے بھرے ہوئے تھے۔

روضہ مقدس کے جاہ وجلال اور عظمت وشان کا ہلکا سا اندازہ ابن بطوطہ کے ان تاثرات سے کیا جا سکتا ہے جس نے ۲۷ے ھ میں اپنی سیاحت کے دوران کربلائے معلیٰ کی زیارت بھی کر لی تھی۔ وہ رقمطراز ہے:۔

"روضہ مقدس کے اندرونی حصہ میں ایک بہت بڑا مدرسہ ہے اور ایک طرف مہمان خانہ ہے جس میں آنے جانے والے کی ضیافت کی جاتی ہے۔ روضہ کے دروازہ پر حجاب و خدام متعین ہیں۔ کوئی شخص انکی اجازت کے بغیر روضہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ آنے جانے والے جب آتے ہیں تو پہلے چوکھٹ کو بوسہ دیتے ہیں جو چاندی کی ہے۔ ضریح مقدس پر سونے چاندی کی قندیلیں آویزاں ہیں۔ دروازوں پر ریشمی پردے آویزاں ہیں"۔

ابنِ بطوطہ کی یہ زیارت اس وقت ہوئی تھی جب کہ ابھی جلائری حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ سلاطینِ جلائری نے اپنے عہدِ سلطنت میں مشاہد مقدسہ کی تقدیس وتکریم اور اُن کی شان وشوکت بڑھانے میں جس طرح پانی کی طرح روپیہ بہایا تھا وہ ابن بطوطہ کو دیکھنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ خصوصاً سلطان اویس اور ان کے بیٹوں حسین اور احمد (۷۵۷ھ تا ۸۰۸ھ) نے جس غیر معمولی شغف اور انہماک کا مظاہرہ کیا، پھر بادشاہ قرا یوسف اور اس کے دونوں بیٹوں سکندر اور جہاں شاہ (۸۱۵ھ سے ۸۷۳ھ) نے حائرِ حسینیؑ کا تزک واحتشام بڑھانے میں اپنی سلطنت کے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ انہوں نے تو اور بھی روضہ اطہر کی رونق اور شان وشوکت دوبالا کر دی تھی۔ غرضکہ خلیفہ مسترشد کے زمانے میں جو روضہ مقدسہ کی شان وشوکت تھی اس سے ہزاروں گنا طمطراق نویں صدی ہجری میں بڑھ چکا تھا جبکہ علی بن محمد بن فلاح نے اس روضہ پر چھاپہ مارا۔ اسی لئے علی بن محمد ابن فلاح کی غارتگری سے روضہ مبارک کا کہیں زیادہ نقصان ہوا بہ نسبت اس نقصان کے جو مسترشد

عباسی کے دور خلافت میں پہنچا۔ اسی لئے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ابن بطوطہ نے آٹھویں صدی میں کربلائے معلیٰ کی جو شان و شوکت دیکھی تھی نویں صدی ہجری میں یہ تزک واحتشام اور رونق پہلے سے بھی کئی گنا بڑھ چکی تھیں۔ خاصکر سلطان اویس الجلائری کے دور میں، جس نے ۷۶۷ھ میں حائر حسینیؑ کی شاندار پیانے پر از سر نو تعمیر کرائی تھی۔ بغداد کے گورنر مرجان نے اپنی ذاتی جائیداد سے جو بغداد، عین التمر، رحالہ اور کربلا میں پھیلی ہوئی تھی بہت بڑے بڑے اوقاف مسجد اور اس عظیم الشان مینار کیلئے جو اُس نے حائرِ مقدسہ میں تعمیر کرایا تھا وقف کئے تھے۔ افسوس کہ یہ عظیم الشان مینار ۱۳۵۴ھ میں خواہ مخواہ منہدم کر ڈالا گیا اور اس سے منسلک جو اوقاف تھے ان کا اب کوئی اتا پتہ نہیں۔

ان تمام باتوں سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ مشعشین کے ہاتھوں حائر حسینیؑ گذشتہ تباہیوں اور تاراجیوں سے بڑھکر ہولناک طریقہ پر تاخت و غارت ہوا۔ پھر ایسی ہی تباہی و بربادی چار صدیوں بعد ۱۲۱۶ھ میں وہابیوں کے ہاتھوں ہوئی۔ چھٹی صدی سے لیکر نویں صدی ہجری تک چار سو برسوں کے دوران اس روضہ اطہر میں جتنا مال و متاع جمع ہوا وہ مشعشین نے لوٹا۔ پھر مشعشین کی غارتگری کے بعد نویں صدی سے لیکر تیرہویں صدی ہجری تک جتنی دولت وہاں جمع ہوئی وہ وہابیوں نے لوٹ لی جو ضلالت و تعصب میں مشعشین ہی کے بھائی تھے۔

عام طور پر اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہابیوں نے ۱۲۱۶ھ میں حائر حسینیؑ کا جو قیمتی مال و متاع، بیش بہا نوادرات اور جواہرات لوٹے تھے ان کی قیمت کم از کم بھی اگر لگائی جائے تب بھی کئی ملین اشرفیوں سے کم نہیں بنتی۔ اسی طرح مشعشین نے نویں صدی ہجری میں جو غارتگری کی تھی انہوں نے بھی اس سے کم کی دولت نہیں لوٹی، اسلئے کہ وہابیوں نے بھی چار سو برس کی جمع شدہ دولت لوٹی اور مشعشین نے بھی وہ تمام مال واسباب، نقد و زر اور ساز و سامان لوٹا جو چار سو برس تک جمع ہوتا رہا تھا۔

وہابیوں کے ہاتھوں ۱۸/ذی الحجہ ۱۲۱۶ھ میں حائرِ حسینیؑ کا انہدام، آتشزدگی، تاراجی وبربادی

کربلا کی تاریخ میں ۱۰/محرم ۶۱ھ کے بعد دوسرا قیامت خیز دن ۱۲۱۶ھ میں وہابیوں کا حائرِ مقدسہ پر حملے کا دن تھا۔ یہ ایسا انتہائی دلدوز اور جگرسوز واقعہ تھا کہ جس کی گونج تمام اسلامی شہروں ہی میں نہیں بلکہ پورے یورپ میں بھی آج تک سنائی دیتی ہے۔ وہابیوں کی درندگی وبربریت کو مسلمان اور یورپی مورخین دونوں ہی نے پوری صراحت کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ بہت سے شعراء نے اپنی طویل نظموں میں اس واقعے کو نظم کرکے ان وحشیانہ مظالم کی تصویر کشی کی ہے کہ جن کو سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس دن کو تاریخ میں دوسرا عاشورۂ محرم قرار دیا گیا ہے۔

ہم پہلے اس واقعے کی نسبت یورپی مورخین کے بیانات قلمبند کرتے ہیں پھر مسلمان مصنفین کے تاثرات نقل کریں گے۔ مشہور انگریزی مورخ مسٹر اسٹیفن ہیملی لونگریک اپنی کتاب ''تاریخ عراق کی چار صدیاں'' مطبوعہ بغداد ۱۹۴۱ء میں خامہ فرسا ہیں:۔

''بارہویں صدی ہجری کے آخر تک نجد کے بدو عرب عقیدہ اور مذہب میں باقی مسلمانوں سے الگ نہیں تھے، یہاں تک کہ محمد بن عبدالوہاب نے اپنی نئی تعلیمات کی نشرواشاعت کی۔ یہ نئی تعلیمات بدوی عرب کے عام مزاج ومیلانات کے عین مطابق تھیں جنکی فطرت ومعاشرت میں لوٹ مار، قتل وغارت کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ ان تعلیمات کو بدو عربوں کے سردار محمد بن مسعود نے دل سے پسند کیا۔ اس محمد بن عبدالوہاب نے بغداد کی دینی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی تھی مگر اس کے مقدر نے اس کا موقعہ دیا کہ انہیں شہروں کو جن میں اس کا قیام رہا تھا عظیم خطرات سے دوچار کرے۔ بغداد سے

وہ مدینہ چلا گیا، پھر نجد کے شہر عونیہ پہنچا۔ وہاں سے بھی مجبور ہو کر اسے بھاگنا پڑا اور اس نے محمد بن مسعود کے ہاں پناہ لی اور اسی کے پاس قیام کیا اور رفتہ رفتہ اس کے ہوش و حواس پر چھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کی دینی اور دنیاوی طاقتیں مجتمع ہو گئیں اور دونوں کے اتحاد نے ایک نئی وحدت اور ایک روح کو اس چھوٹی سی حکومت کی شکل میں جنم دیا جس نے غلبہ واقتدار سے کام لے کر اپنے عقائد کی تبلیغ کی''۔ (ص: ۲۲۷)

''امیر محمد بن سعود ۱۱۷۹ھ بمطابق ۱۷۶۵ء میں مر گیا اس کی جگہ اس کا بیٹا عبدالعزیز بن سعود بادشاہ ہوا۔ ۱۱۸۹ھ آتے آتے یہ ابن سعود جزیرۂ نما عرب میں بہت بڑی قوّت واقتدار کا مالک بن گیا اور اسی وقت سے ابن سعود کی بادشاہت وہابی عقیدہ کے ساتھ مشہور ہوئی۔ ان سعودیوں کی مذہبی جھڑپیں چاروں طرف پھیل گئیں۔ اور ۱۲۰۵ھ آنے تک مملکت عراق ایک ایسے نئے پڑوسی کے وجود کا احساس کرنے لگا جو کسی معاہدہ پر قائم رہنے والا نہیں تھا۔ کیونکہ وہابیوں نے عراق کی سرحدوں پر بار بار حملے کرنا شروع کئے۔ وہابیوں اور اہلِ عراق کے درمیان ۱۲۱۴ھ میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا اسلئے کہ ایسی صلح جس میں معاندانہ تعصب کی بھی آمیزش ہو اور بدوؤں کی بدویت بھی، اس کے برقرار رہنے کی امید کبھی نہیں کی جا سکتی۔ ایک ہی برس کے بعد نجد کے قریب وہابیوں نے خزاعل کے حاجیوں پر حملہ کیا، پھر دوسرے موقعے پر ٹھیک اسی جگہ ایرانی حاجیوں کو لوٹ لیا۔ (ص: ۲۳۱)

اس موقعے پر مسٹر لونگریک نے اس اندوہناک اور وحشیانہ حملے کا بڑی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے جو وہابیوں نے کربلا پر کیا، جہاں نہ کوئی فوجی چھاؤنی تھی اور نہ ہی لڑنے والے کوئی سپاہی۔ وہ اس طرح خامہ فرسا ہیں:۔

''یہ المناک مصیبت و بربادی اپنے انتہا تک جا پہنچی۔ اس غارت گری نے

سعودیوں کی درندگی، شقاوت قلبی، بے پناہ بھوک اور حد درجہ کی حرص وطمع پوری دنیا پر آشکار کردی۔ حدتو یہ ہے کہ یہ ساری دہشتگردی دین ومذہب کے نام پر ہوئی۔

عراقی فوجیں ان کے مقابلہ کیلئے روانہ ہوئیں مگر ابھی فوجیں بغداد چھوڑنے بھی نہ پائی تھیں کہ ان کو خبر ملی کہ وہابیوں نے کربلا پر حملہ کر کے اسے پوری طرح تاراج کردیا ہے۔ یہ کربلا شیعوں کا بہت مقدس اور دولت مند شہر ہے۔''

اس کے بعد مسٹر لونگریک وہابیوں کے کربلا پر حملہ، حرم مقدسہ کا انہدام اور ان کی تخریب کاریوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

''ماہ نیساں کی دوسری تاریخ کی شام ہوتے ہوتے یہ خبر پھیل گئی کہ وہابی کربلا کے نزدیک آپہنچے ہیں جبکہ شہر کے اکثر لوگ نجف میں زیارت بجالا رہے تھے۔ کربلا میں جو لوگ رہ گئے تھے انہوں نے فوری طور شہر کے دروازے بند کردیے مگر وہابی جو ایک ہزار سواروں کی تعداد میں تھے وہاں آکر اُتر پڑے۔ انہوں نے اپنی طاقت کو تین حصوں میں تقسیم کرلیا اور شہر پناہ کی فصیل میں ایک جگہ چھید کرلیا اور وہیں سے اندر گھس کر شہر کے دروازے کھول دیے۔ پھر سب کے سب شہر میں داخل ہوئے۔ کربلا کے باشندوں پر وحشت طاری ہوگئی اور سراسیمگی کے عالم میں ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ وحشی وہابی سیدھے ضریح مقدس کے پاس پہنچے اور اس کا انہدام شروع کردیا۔ ہر چیز توڑ پھوڑ کر ڈالی۔ لکڑیاں، بڑے بڑے آئینے چکنا چور کردیے اور روضے میں جتنی بیش بہا اور نفیس اشیاء تھیں جو بادشاہان عرب اور شاہانِ فارس کی نذر کئے ہوئے تحائف وہدایا تھے سبھی لوٹ لئے۔ اسی طرح دیواروں میں جو قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے، چھت میں جو سونا تھا، شمع دان، قالینیں، بیش بہا جھاڑ فانوس، مرصع دروازے غرض کہ اس قسم کی جتنی بھی چیزیں وہاں تھیں توڑ پھوڑ کر باہر ڈھیر کردی گئیں۔(ص:۲۲۳)

اس کے بعد مسٹر لونگ ریک نے انسانی ضمیر سے ان ہزاروں بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور مردوں کی وحشیانہ اور بہیمانہ ہلاکت کی فریاد کی ہے جو وہابیوں کی درندگی اور بربریت کے بھینٹ چڑھے۔ وہ اس طرح خامہ فرسا ہے:-

''تقریباً پچاس آدمی ضریح مطہر کے پاس مارے گئے۔ پندرہ سو افراد ضریح کے باہر صحن میں قتل ہوئے۔ ان درندوں شہر کربلا کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ جس کو بھی پایا اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہر گھر میں گھس کر مال و متاع لوٹ لیا۔ انہوں نے نہ کسی بوڑھے پر ترس کھایا نہ کسی بچہ پر، نہ عورت کی عزت و آبرو کا احترام کیا نہ مردوں کا۔ اس بربریت و بہیمیت اور دار و گیر سے کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ بعض لوگوں کا تخمینہ ہے کہ ہزار آدمی مارے گئے اور عراق کی فوجوں کا کربلا آنے سے کوئی فائدہ نہ ہو سکا۔ سپہ سالار فوج نے کربلا و حلہ و کفل کی فوجوں کو ایک جگہ جمع کیا اور نجف میں روضہ اطہر میں جو مال و اسباب تھا وہ بغداد منتقل کیا پھر اس نے کربلا کی ایک مخصوص شہر پناہ بنائی اور وہابیوں سے کسی قسم کا انتقام نہیں لیا۔

اس ہولناک سانحے نے شیخ سلیمان پاشا والیٔ بغداد کو انکے بڑھاپے میں جان لیوا صدمہ پہونچایا۔ ایران اور ترکی کے ہر حصہ میں خوف و ہراس پھیل گیا اور وہابی درندے لدے پھندے کربلا کی ساری دولت لئے اپنے گھر واپس پہنچ گئے۔'' (ص ۲۳۳)

وہابیوں کے ہاتھوں کربلا معلیٰ کی اس روح فرسا تاخت و تاراجی کو مسٹر لونگر یک کی طرح بہت سے مسلم مورخین نے بھی نقل ہے۔ ان وہابیوں نے حائر مقدس کو منہدم کر دیا۔ شہر کے ایک ایک گھر کو لوٹ لیا اور ہزاروں نہتے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کا قتل عام کیا۔

(اعیان الشیعہ جلد: ۴۔ ص: ۳۰۷ کتاب شہداء الفضیلہ علامہ امینی وغیرہ)

اس بربریت اور تاراجی کی مکمل سرگذشت ''تاریخ کربلائے معلیٰ'' کے صفحہ

۲۰ تا ۲۲ پر کچھ ان الفاظ میں مذکور ہے:۔

''کربلائے معلیٰ چار صدیوں سے زیادہ عرصے تک چین وسکون سے رہا یعنی مشعشین کی غارتگری سے لیکر ۱۲۱۶ھ تک۔ اس دور میں کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہوا جو کربلا کے باشندوں کیلئے پریشانی کا باعث ہو یہاں تک کہ ۱۲۱۶ھ میں شاہ سعود وہابی نے ایک بہت بڑا لشکر جو بیس ہزار فوجیوں پر مشتمل تھا تیار کیا اور کربلا پر چڑھائی کی۔ کربلا معلیٰ کی شہرت اور شان وشوکت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ یہاں ایرانی، ترکی اور عربی زائرین کا ایک بڑا اژدحام رہتا۔ سعود نے کربلا کا محاصرہ کرکے پہرے داروں اور باشندوں کا بہیمانہ طور قتل عام کیا۔ اس کے فوجیوں نے ایسی درندگی و بربریت کا مظاہرہ کیا کہ جس کو بیان کرنے سے قلم قاصر ہے۔ ایک رات میں تقریباً بیس ہزار افراد مارے گئے۔ اس قتل عام سے فارغ ہوکر روضۂ حسینیؑ کے خزانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ خزائن بے شمار مال واسباب اور قسم قسم کی نفیس نوادرات سے بھرے ہوئے تھے۔ سعود نے جو کچھ مال ومتاع پایا سب لوٹ لیا۔ اسی لوٹ میں ایک بہت بڑا موتی اُسکے ہاتھ لگا۔ بیس تلواریں جن کے قبضے اور میانیں سونے کی تھیں اور ان میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے، سونے چاندی کے ظروف، فیروزے، ہیرا اور بہت سارا قیمتی مال واسباب لوٹ لیا۔

ان بیش بہا اثاثوں، نقد وزر اور فرش وفروش کے علاوہ چار ہزار کشمیری شالیں، دو ہزار چاندی کی تلواریں، بے شمار بندوقیں اور اسلحے بھی لوٹ لئے گئے۔ اس جانکاہ المیے کے بعد کربلا ویران اور اُجاڑ ہوگیا۔ سعود کے چلے جانے کے بعد کربلا کے وہ باشندے جو جان بچا کر بھاگ گئے تھے پھر کربلا واپس آئے۔ جو کچھ ممکن ہوسکا روضۂ حسینیؑ کی تعمیر ومرمت کی اور رفتہ رفتہ پھر کربلا آباد ہونے لگا۔ انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ہندوستان کا کوئی بادشاہ کربلا معلیٰ کی زیارت کو آیا۔ کربلا کی حالت دیکھ کر اسے

شدید دلی قلق ہوئی۔ اُس نے کربلا میں خوبصورت بازار تعمیر کرائے۔ جن لوگوں کے گھر اجڑ چکے تھے اُن کیلئے مکانات بنوائے۔ شہر کیلئے ایک بہت مضبوط فصیل بنوائی تاکہ دشمنوں کے حملوں سے شہر محفوظ و مامون رہ سکے، اردگرد بہت سے برج اور دیدبان تعمیر کرائے اور آلات دفاع نصب کئے جسکی وجہ سے یہ شہر دشمنوں کے حملوں سے بڑی حد تک محفوظ ہو گیا اور رفتہ رفتہ پہلے جیسی ترقی اور رونق پھر اجڑے دیار کو حاصل ہونے لگی۔

اس دلدوز و جگر خراش سانحہ نے خون کے آنسو رلوائے۔ ہر ملک کے مسلمانوں کے دل تڑپ اٹھے اور تمام اسلامی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی کیونکہ وہابیوں کی اس غارتگری نے بالکل وہی نقشہ پیش کر دیا تھا جو یزیدی فوجوں کے ہاتھوں ۱۰ محرم ۶۱ھ میں پیش آیا تھا۔

مسٹر لونگریک لکھتے ہیں کہ کربلائے معلیٰ کو تاخت و تاراج کرنے کے دوسرے ہی برس ۱۲۱۸ھ میں عبدالعزیز بن سعود، بغداد کے پاشا کی سازش سے مارا گیا۔ اس کا قاتل ایک افغانی ملا تھا جس کا قیام بغداد میں تھا۔ اس نے عبدالعزیز کو اپنے بیٹوں کے انتقام میں قتل کیا جنہیں ابن سعود کی فوجوں نے کربلا پر یلغار کے دوران ہلاک کر دیا تھا۔

حائر حسینیؑ اور اس کا مشہور مینار عبد جو ۱۳۵۴ھ میں منہدم ہوا

جیسا کہ پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے کہ مرجان نامی ایک غلام نے حائر حسینیؑ میں ایک بہت ہی عظیم الشان مینار تعمیر کیا تھا جو فن تعمیر کا ایک بہترین شاہکار تھا۔ یہ "منارۂ عبد" کے نام سے مشہور تھا اور روضۂ حسینیؑ کے صحن کے شمال مشرقی حصہ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ مینار ۱۳۵۴ھ میں بیخ و بن سے اکھاڑ دیا گیا۔ اس کے انہدام کے وقت کی تصویریں بہت سے اخبارات اور رسائل میں شائع ہو چکی ہیں، جن میں مینار کے اوپر مزدور بیلچوں سے مینار کو توڑتے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ان تصاویر سے یک لخت ماضی کے واقعات کی جھلکیاں ذہن کے پردوں پر گھوم جاتی ہیں۔ آج جبکہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے

اور ہر ملک میں آثار قدیمہ کی خصوصی حفاظت کی جاتی ہے مگر حکومت عراق نے جب بلا وجہ اس تاریخی مینار کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا تو گذشتہ ادوار میں کیا کچھ نہیں کیا گیا ہوگا۔

ہم ذیل میں اس مینار کی مجمل توصیف، اس کی سنگِ بنیاد رکھنے کی تاریخ، اس کے اوقاف، شاہ طہماسپ صفوی کے عہد میں اس کی تجدید و مرمت، اس کے انہدام کے اسباب اور صحن اقدس کی توسیع کے تناظر میں کچھ تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

(۱) صحن حسینیؑ اور اس کا سر بفلک گنبد: ۱۳۵۴ھ تک صحن حسینی تین میناروں کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ آسمان سے باتیں کرنے والے ان خوبصورت بلند و بالا میناروں کی وجہ سے حائر مقدس کی بڑی آن و بان تھی۔ دو مینار حرم کے آگے اور تیسرا حرم کے پیچھے واقع تھا۔ صحن کے مشرقی حصے میں یہی تیسرا ''مینار عبد'' نام سے مشہور وہ تاریخی مینار تھا جو حائر حسینیؑ کی رونق، حسن و جمال اور جاہ و جلال کو چار چاند لگاتا تھا۔ یہ مینار صحن کے مشرقی حصے میں چہار دیواری سے ملحق تھا اور حضرت عباسؑ کے روضہ کی طرف جانے میں بائیں طرف پڑتا تھا۔ یہ مینار ان تمام میناروں سے جو فی الوقت عتبات عالیات کربلا، نجف، کاظمین اور سامرا میں موجود ہیں بلند اور پُرشکوہ تھا۔ عراق کی تاریخی عجائبات میں اس کا دوسرا نمبر تھا۔ اس کے نچلے حصہ کا قطر بیس میٹر اور اس کی اونچائی چالیس میٹر تھی۔ ان گنت نادر پتھر اور کاشانی نقش و نگاری اس مینار کی شان دوبالا کرتی تھی۔ موجودہ آثارہ قدیمہ میں فن تعمیر کا شاید ہی کوئی اس جیسا شاہکار عجوبہ پایا جاتا ہو۔ اس انہدامی کاروائی کے بعد یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ انمول سامان کیا ہوا جس سے اس مینار کو مزین کیا گیا تھا؟

(۲) اس مینار کی تاریخ تعمیر، کس نے اِسے تعمیر کیا؟ اور اس کیلئے کتنی جائداد وقف تھی

جیسا کہ پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے کہ مرجان نامی ایک غلام، سلطان اویس جلائری کی طرف سے عراق کا گورنر تھا۔ اس غلام نے بغاوت کر دی اور سلطان اویس نے اس کی

سرکوبی کیلئے ایک لشکر جرار تبریز سے روانہ کیا۔ مرجان کے ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ کر علاحدہ ہوگئے۔ جب وہ بے یار و مددگار رہ گیا تو کربلا کی طرف فرار اختیار کیا اور حرم حسینیؑ میں پناہ گزیں ہوا اور وہاں اُس نے یہ مشہور مینار تعمیر کیا۔ جو بعد میں ''منارہ عبد'' کے نام سے مشہور رہوا۔ اس کے ملحق اس نے ایک جامع مسجد بھی بنوائی تھی اور ان دونوں عمارتوں کیلئے بغداد، کربلا، عین التمر اور رحالہ میں جو اس کی ذاتی جائیداد اور املاک تھیں وقف کردیں۔ یہ سارا املاک حرم حسینیؑ کے اوقاف میں شامل ہوگیا۔ خود مرجان سلطان اویس جلائری کے خوف سے حرم حسینیؑ میں معتکف ہوگیا۔ سلطان کو جب اُس کے کارناموں کی اطلاع ملی تو اس کو اپنے پاس بُلایا۔ اس کی خطا معاف کر کے اس کی عزت افزائی کی اور انہیں پھر عراق کا گورنر بحال کردیا۔ اس کے فوراً بعد سلطان اویس دوئم نے خود شعائر حسینیؑ کی عظمت و رونق بڑھانے اور اس کی عمارت از سرِ نو تعمیر کرنے کا کام اپنے ہاتھوں میں لیا۔

(۴) سنہ ۹۸۲ھ میں ''منارۂ عبد'' کی شاہ طہماسپ صفوی کے ہاتھوں مرمت

''منارۂ عبد'' اپنی تعمیر کے دو سو سال بعد کچھ ضروری تجدید و مرمت کا محتاج ہوا اور لازمی بن گیا کہ اسکی زیبائش و آرائش میں اضافہ کیا جائے۔ جس کے پیش نظر شاہ طہماسپ صفوی بن شاہ اسماعیل صفوی نے ۹۸۲ھ میں جہاں حائر مقدس کی تجدید و مرمت کی، شمالی طرف صحن کو وسعت دی، وہاں اس مینار پر بھی دل کھول کر روپے خرچ کیے۔ صحن حسینیؑ پہلے کاظمین کے صحن کی طرح سہ رخا تھا یعنی مشرق و مغرب اور جنوب تین اطراف صحن تھا پھر شاہ طہماسپ نے شمال کی جانب بھی اس کا صحن نکالا۔ اس تعلق سے علامہ مجلسیؒ رقمطراز ہیں:

> ''جہاں تک میری علمیت کا تعلق ہے حائر حسینیؑ صحن قدیم پر مشتمل تھا۔ صفوی حکومت نے جس حصہ کا اس میں اضافہ کیا، وہ حصہ پہلے والے صحن میں شامل نہیں تھا۔ آثار و قرائن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے اور میں نے کربلا کے زائروں سے بھی سنا ہے

کہ صحن میں نہ تو قبلہ کی جانب کوئی تغیر کیا گیا نہ دائیں طرف نہ بائیں طرف بلکہ پشت قبلہ کے حصہ میں اضافہ ہوا"۔ (بحارالانوار۔جلد:۱۸۔ص:۸۵۳)

شاہ طہماسپ کی اس تجدید و مرمت کی تاریخ 'انگشت یار' سے نکالی گئی جس کے اعداد ۹۸۲ ہیں۔

(۴) تاریخی 'منارہ عبد' کا ۱۳۵۴ھ میں انہدام اور اس کے اسباب

یہ تاریخی مینار چھ سو برس تک یعنی ۷۶۷ھ سے لیکر ۱۳۵۴ھ تک ہر قسم کے حوادثات و تغیرات زمانہ سے بالکل محفوظ اور صحیح و سالم رہا۔ پھر دفعتاً ایک دن یہ مینار کدالوں اور پھاوڑوں کی زد میں آ گیا اور بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ مینار ٹیڑھا ہونا شروع ہو گیا تھا اور خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں ناگاہ نہ گر پڑے اسلئے لازم بن گیا کہ قبل اس کے کہ یہ مینار منہدم ہو کر حائر حسینیؑ کو نقصان پہنچائے اسے گرا دیا جائے۔ سننے میں تو یہی بات آتی ہے۔ اسی بنیاد پر آسمان سے باتیں کرنے والا یہ مینار زمین بوس کر دیا گیا اور اب صرف اس کی تصاویر اخبارات و جرائد اور کتابوں میں باقی رہ گئی ہیں۔

لیکن کس شخص نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ مینار گرنے والا ہے یہ اب تک معمہ ہے۔ کیا واقعی اس مینار میں ٹیڑھا پن پیدا ہوا تھا اور اس کے گرنے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا اس کے متعلق ہم یقین سے کچھ کہنے سے قاصر ہیں اور اگر اس مینار میں کجی بھی آ گئی تھی اور احتیاط کے طور پر اس کو منہدم کر دینا ضروری ہو گیا تھا تو کیا یہ مینار اپنی جڑ سے کج ہو گیا تھا اور اس کا خطرہ اسی طرح ٹل سکتا تھا کہ اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جاتا، اس کے بارے میں بھی ہم وثوق سے کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ یہ سب باتیں تو کوئی ماہر و تجربہ کار انجینئر ہی بتا سکتا ہے۔ البتہ عام طور پر جو باتیں زبان زد خاص و عام ہیں اُن سے یہی اخذ ہوتا ہے کہ اس مینار کا انہدام خاص اغراض اور ایک سازش کے تحت ہوا کیونکہ اس مینار کے ساتھ ساتھ اُن اوقاف پر بھی پردہ ڈال دیا گیا ہے جو اس سے منسلک تھے۔

حائرِ حسینیؑ کی وہ تجدید جو بعد کے ادوار میں ہوئیں

۹۱۴ھ میں شاہ اسماعیل صفوی کی عہد کی اصلاحات

قبر مطہر پر آج جو عمارت ایستادہ ہے یہ من وعن وہی عمارت ہے جس کی تعمیر کا سلسلہ سلطان اویس الجلائری نے ۷۶۷ھ میں شروع کیا تھا اور اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹوں سلطان حسین اور سلطان احمد نے ۷۸۶ھ میں پائے تکمیل تک پہنچادیا۔ اس کے بعد ایرانی اور ترکی امرأ و سلاطین نے اس روضۂ مقدسہ کی تزئین و آرائش اور اس کو مستحکم اور خوبصورت سے خوبصورت تر بنانے اور اس کی اصلاح و تجدید میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہر دور اور ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی بادشاہ یا امیر حائر حسینیؑ میں کسی نہ کسی قسم کی تعمیر و اصلاح و مرمت میں ضرور مصروف رہا۔ وہ سلاطین جنہوں نے دسویں صدی ہجری کے آغاز میں اس حائر مطہر کی تجدید و مرمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اُن میں شاہ اسماعیل صفوی کا نام سرفہرست ہے کیونکہ صفوی شہنشاہیت جس کی داغ بیل اسی شاہ اسماعیل نے ڈالی تھی دینی شعور و احساسات کا نتیجہ تھی اور یہ شعور و احساسات شیعی عقائد پر مبنی تھے جیسا کہ مسٹر لانگریک نے بھی اپنی کتاب ''تاریخ عراق کی چار صدیاں'' کے صفحہ: ۲۰ پر اعتراف کیا ہے۔ اس توّسط سے صفوی شہنشاہیت بالکل ایسی ہی تھی جیسی مصر میں فاطمی سلطنت۔ شاہ اسماعیل نے ۱۵۰۸ء میں عراق کی ترکمانی حکومت کا خاتمہ کر کے بغداد کو اپنی سلطنت میں شامل کیا اور جیسے ہی عراق شیعی حکومت کے زیرِ نگین آیا شاہ اسماعیل فوراً تمام عتبات عالیات کی زیارت کو عراق پہنچے۔ مسٹر لانگریک لکھتے ہیں:

''اُن کی فوجوں کے قدم بغداد میں جیسے ہی جمے، شاہ فوراً کربلا و نجف کی

زیارت کو آپہنچے۔(ص:۲۰) یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے صفوی بادشاہت کے قیام اور ترکوں، منگولوں، تاتاریوں اور ترکمانوں سے جنگ کو عربی قومیت کی تحریکِ نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا ہے جبکہ عربی قومیت کی تحریک قریب قریب بے جان ہو چکی تھی کیونکہ سلاطین صفویہ کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے جا ملتا ہے۔اس بنیاد پر یہ لوگ خالص عرب تھے اور انہوں نے ائمہ معصومینؑ کے مشاہد مشرفہ کی جو گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں بعض لوگوں کے خیال میں وہ محض عرب قومیت کے جذبے کے تحت جو انئی دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھا۔یہ لوگ اسلامی معاشرہ کو خالص عربی رنگ میں رنگنے کے خواہشمند تھے۔شاہ اسماعیل نے نجف و کربلا کی زیارت کے ساتھ ہی اسکی تعمیر وتجدید کی کاروائی بھی انجام دی اور پورے شہر کربلا کی آبادکاری کا بہتر انتظام کیا۔اُن ہی کے دور میں نہرِ شاہ تعمیر ہوئی جو آج تک اسی نام سے موسوم ہے۔امام موسیٰ کاظمؑ جو شاہ کے جدّ اعلیٰ تھے کی زیارت کے موقعہ پر شاہ نے حکم جاری کیا کہ ضریح کے گرد عالیشان عمارت تعمیر کی جائے"

(التاریخ الحدیث نشر از وزارت معارف ص:۹ مطبوعہ بغداد ۱۹۴۶ء)

شاہ اسماعیل کا زیارتِ حضرت امام حسینؑ کی خاطر کربلا معلیٰ آنے اور روضۂ اطہر اور وہاں کے مجاورین اور باشندگان کی گرانقدر دل نوازی کا تذکرہ "حبیب السیر" میں بھی آیا ہے۔صاحبِ "حبیب السیر" نے یوں اس کا منظر کھینچا ہے:۔

"تسخیرِ بغداد کی تکمیل کے بعد شاہ اسماعیل صفوی کامیاب وکامران سرخرو ہو کر ۲۵ر حمید الثانی ۹۱۴ھ کو بغداد میں داخل ہوئے۔اگلے ہی دن عتبۂ مقدس کے طواف کا ارادہ کیا۔کربلا پہنچ کر انتہائی اہتمام سے مراسم زیارت بجالائے۔روضہ کی تعظیم واحترام کے جملہ شرائط کی پابندی کی۔انتہائی خضوع وخشوع سے چوکھٹ کو بوسہ دیا۔اپنے

رخسار خاک پر ملے، روحِ سید الشہداءؑ سے مناجات کی۔ اللہ کی مدد کے خواستگار ہوئے۔ روضہ کے مجاورین کو طرح طرح کے تحائف و ہدایا دئے۔ قبر شریف کے صندوق کو زر کشی کے کام کئے ہوئے کپڑے پہنائے، جن پر سونے چاندی کا کام کیا ہوا تھا۔ قبر مطہر پر خالص سونے کی بارہ قندیلیں چڑھائیں، جن کی چمک دمک سے رات میں دن کا گمان ہوتا تھا۔ روضۂ اطہر میں بہترین نقش و نگاری اور باریک کام کئے ہوئے فرش بچھائے (یہ تمام ہدایا ۱۲۱۶ھ میں وہابیوں نے لوٹ لئے تھے)۔ خدّامِ حرم کی شاہانہ ضیافت کی۔ شاہ اسماعیل نے غروب آفتاب سے لے کر طلوع آفتاب تک پوری رات روضے میں اس طرح گذاری کہ اپنے جدّ مظلومؑ کی قبر سے لپٹے ہوئے تھے"۔

پھر صاحب "حبیب السیّر" شاہ اسماعیل کی زیاراتِ نجف اشرف، کاظمین اور سامرا کی تصویر کشی کرتے ہوئے آگے رقم طراز ہیں:-

"بغداد واپس آکر شاہ اسماعیل پھر عتباتِ مقدسہ کی رونق وشان و شوکت بڑھانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہر روضہ پر نقار خانہ بنوایا تاکہ صبح و شام شاہانہ سلام کی رسم ان نقار خانوں کے ذریعہ انجام پاتی رہے جس طرح بادشاہوں کے قصور و محلات میں رواج تھا اور جیسا کہ آج بھی امام رضاؑ کے روضہ پر ایسی نوبت بجا کرتی ہے"۔

بعد ازاں شاہ اسمٰعیل نے حکم دیا کہ ماہر صنعت کاروں کو ملک کے گوشہ گوشہ سے اکٹھا کیا جائے۔ اُن کے مجتمع ہونے پر حکم دیا کہ کربلا و نجف و کاظمین اور سامرہ میں ائمہ طاہرینؑ کی قبروں پر جو مدتِ مدید سے صندوق چلے آرہے ہیں اُن کی جگہ بہترین صناعی و کاریگری اور نقاشی سے مرّصع نئے صندوق تیار کئے جائیں۔

شاہ اسماعیل سے جتنا ممکن ہوسکا اُس نے عتبات عالیات کی تعظیم و تکریم اور اُن کی رونق اور طمطراق بڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ایک مدت تک عراق میں

سکون واطمینان کی فضا قائم رہی مگر کچھ ہی دنوں بعد جب شاہ سلیم ترکی کا بادشاہ ہوا تو اُس میں اور ایرانی سلاطین میں عراق پر قبضے کے تعلق سے سخت رسہ کشی شروع ہوگئی۔

مسٹر لونگریک ''تاریخ عراق کی چار صدیاں'' میں اس حوالے سے خامہ فرسا ہیں:

''ترکی کا شاہ سلیم متضاد صفات کا حامل تھا۔ نئی شیعی حکومت کا جاہ وجلال، دبدبہ و شوکت اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اُس نے سُنی مذہب کی حمایت پر اعلان جنگ کردیا اور اپنی حکومت کے ابتدائی مہینوں میں ہی شیعوں کا بُری طرح قتل عام کیا۔ جہاں بھی اُنہیں پایا تہہ تیغ کردیا۔ (ص:۲۱)

ان لڑائیوں میں اپنی سلطنت بڑھانے اور دوسری حکومتوں پر قبضہ کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی مذہب تھا۔ آخر کار ترک عثمانی حکمرانوں نے عراق فتح کیا اور یہ فتح شاہ سلیم کے بیٹے سلطان سلیمان قانونی کے ہاتھوں ۹۴۱ھ میں انجام پائی۔

شاہ اسماعیل صفوی نے حائر مقدس کے لئے جو صندوق بنوایا تھا، وہ ۹۳۲ھ میں بن کر تیار ہوا تھا۔ جیسا کہ ''تاریخ کربلائے معلیٰ'' کے صفحہ:۱۵ پر مذکور ہے۔ لیکن قبر مطہر پر جو صندوق فی الوقت موجود ہے اس کے تیار ہونے کی تاریخ ۱۱۳۳ھ ہے، غالباً یہ صندوق شاہ طہماسپ صفوی کے دور میں روضہ پر نصب ہوا ہوگا۔ یہ تاریخ صندوق کے جنوب مشرقی طرف ہاتھی دانت کے حروف سے کندہ ہے۔ پھر اس کی تجدید ومرمت ۱۲۲۵ھ میں قاچاری سلاطین کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس پر کندہ اس عبارت سے پتہ چلتا ہے:

''۱۲۱۶ھ میں دشمنان خدا کے ہاتھوں (وہابیوں نے اس صندوق کو توڑ پھوڑ کر نذر آتش کیا تھا) اس صندوق کی شکست وریخت کے بعد خان جان قاچار نے ۱۲۲۵ھ میں اس صندوق کو از سر نو بنوایا''۔

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ شاہ اسماعیل صفوی نے جو صندوق بنوایا تھا وہ کیا ہوا۔

سلطان سلیمان قانونی کی تجدید کاری

سلطان سلیمان قانونی نے ۹۴۱ھ میں عراق تسخیر کرلیا، مگر چونکہ عراق صفوی سلاطین کے زیرنگین رہ چکا تھا اور عراق کے باشندے ان کی دینداری اور حسن سلوک سے کافی متاثر تھے پھر یہاں شیعوں کی خاصی تعداد بھی تھی اسلئے سلطان سلیمان کے دل میں یہ بات جاگزین ہوگئی کہ اگر عتبات عالیات کی ذرا بھر بھی بے حرمتی کی گئی تو لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت ومخاصمت اور صفویوں کی حمایت میں اضافہ ہوگا۔ اسی بنا پر سلطان سلیمان نے عتبات عالیات اور وہاں کے باشندوں کوخوش رکھنے کی پوری کوشش کی۔ چونکہ سابق صفوی سلاطین بہت زیادہ دیندار اور مذہب پرست تھے اسلئے سلطان سلیمان نے بھی ضروری سمجھا کہ اس میدان میں بھی ہمیں اُن سے کمتر نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس نے واقعی تعظیم وتکریم کے ساتھ کاظمین کی زیارت کی اور شاہ اسماعیل نے کاظمین میں جو بڑی جامع مسجد کی تعمیر شروع کی تھا اُس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا حکم دیا۔ پھر شیعہ اور سنی دونوں کے مذہبی مقامات مقدسہ کے لئے بہت سی جاگیریں وقف کیں[1]۔

(بحوالہ تاریخ عراق کی چار صدیاں ص: ۳۰، ۳۱)

سلطان نے عراق کے باشندوں کوراضی رکھنے کی اتنی ہی پالیسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس نے کربلا اور نجف اشرف کی زیارتیں بھی کیں اور شاہ اسماعیل سے زیادہ وہاں خدمات

[1] یہ تمام موقوفہ جائیداد سو برس کے بعد سلطان مراد رابع نے ۱۶۳۸ء کے اصلی اوقاف بھی ضبط کرلئے اور انہیں اہلسنت کے اوقاف میں شامل کردیا (تاریخ عراق کی چار صدیاں ص: ۸۰-۷۹)

انجام دیں۔ کربلا معلیٰ کی سرزمین کبھی کبھی دریا کی طغیانی کے زد میں آجاتی تھی، سلطان سلیمان نے باندھ بنوا کر اس مقدس شہر کو غرقابی سے محفوظ و مامون کر دیا۔ یہ باندھ آج بھی روف سلیمانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے نہر حسینیہ کی تجدید و مرمت کا حکم صادر کیا، جس کے نتیجے میں پانی باغات اور کھیتوں تک پہنچنے لگا۔ ان تمام خدمات کی وجہ سے سلطان سلیمان کی کافی شہرت و مقبولیت ہوئی۔ (التاریخ الحدیث ص:۱۲)

سلطان سلیمان عتباتِ عالیات کی زیارت کو کب آیا اور کس طرح زیارت بجالایا اس کی تفصیل صاحب ''تحفۃ العالم'' نے یوں بیان کی ہے:-

''سلطان سلیمان عثمانی ۱۸ر جمادی الاوّل ۹۴۱ھ کو بغداد میں داخل ہوا، اس نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ اور حضرت امام محمد تقیؑ کے روضۂ کاظمین کی زیارت کی۔ پھر حضرت امیرالمومنینؑ اور امام حسینؑ کے روضہ ہائے مطہرہ کی زیارت کا ارادہ کیا۔ ان دونوں اماموں کی روحوں سے مدد کی درخواست کی اور جب نجف کی زیارت کو چلا تو قبۂ مقدسہ پر نظر پڑتے ہی چار فرسخ پہلے گھوڑے سے اتر کر پیادہ پا ہو گیا۔ اس کے بعض ساتھیوں نے جب اس کی وجہ پوچھی تو کہا کہ قبہ پر نظر پڑتے ہی میرے جسم پر کپکپی طاری ہوئی۔ گھوڑے پر بیٹھنے کی طاقت ہی باقی نہیں رہی۔ کسی نے کہا ابھی نجف بہت دور ہے اور آپ پیدل وہاں جا نہیں پائیں گے۔ سلطان سلیمان نے کہا میں قرآن مجید سے تفاول کرتا ہوں۔ جب اُس نے مصحف کھولا تو یہ آیت نکلی'' فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى''۔ سلطان کچھ دور گھوڑے پر بیٹھ کر چلتا اور کچھ دور برہنہ پا۔ اسی حالت میں پورا راستہ طے کر کے روضۂ نجف اشرف میں داخل ہوا''۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عراق کے ان عتبات عالیات کو کس قدر قوت و اقتدار اور اسلامی ممالک میں اثر و نفوذ حاصل تھا۔ ملوک و سلاطین مشکلات کے وقت کس

طرح ان عتبات عالیاتؑ سے مدد کے خواستگار ہوتے۔ اپنی حکومت کو استحکام بخشنے اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے ان ہی مشاہد مشرفہ کا سہارا لیتے۔ سلطان سلیمان جس نے بڑے بڑے معرکے سر کئے، فتوحات حاصل کیں، جس نے مشرقی یورپ کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اس کی کیفیت یہ تھی کہ روضہ ہائے کربلا و نجف کا تقرّب اور اُن کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جی جان سے کوشش کیا کرتا۔

سلطان سلیمان نے عتبات مقدس کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، ارواح ائمہ معصومینؑ سے جس طرح امداد کی خواستگاری کی۔ قبۂ منورہ کو دیکھ کر گھوڑے سے اُتر کر پیدل چلنے لگا۔ برہنہ پا چل کر نجف تک پہنچا اور جس طرح اُس نے اُس خوشامدی کو قتل کر ڈالا تھا جس نے اُسے امیر المومنینؑ پر فضیلت دی تھی اور کہا تھا کہ آپ زندہ خلیفہ ہونے کی وجہ سے افضل ہیں۔ یہ ساری باتیں شیعوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے اور عتبارت عالیات کی خوشنودی کے لئے تھا تا کہ ان کی حکومت کو استحکام ملتا۔ وجہ یہ ہے کہ ان مشاہد مشرفہ کو اسلامی حکومتوں کے درمیان توازن قائم رکھنے میں بہت بڑا اثر و نفوذ حاصل تھا اور ان ہی کے ذریعے اقتدار کو سہارا ملتا تھا۔ (تاریخ عراق کی چار صدیاں۔ ص: ۳۰)

تیسری فصل

دولت صفویہ کی اصلاحات

بعہد شاہ طہماسپ، شاہ عباس اور نادر شاہ

جب بھی کبھی حائر حسینیؑ کو تجدید و مرمت کی ضرورت آن پڑی تو شاہ اسماعیل کے بعد دوسرے صفوی حکمرانوں نے بھی وقتاً فوقتاً اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا خواہ عراق پر اُن کی حکومت رہی ہو یا نہ رہی ہو۔ شاہ طہماسپ نے اپنے چون سالہ دورِ حکومت میں ۹۳۰ھ

سے لیکر ۹۸۴ھ تک کئی مرتبہ حائر حسینیؑ پر بے تحاشہ دولت صرف کی۔ اس نے روضۂ مقدسہ کی مرمت اور اصلاحات کے علاوہ منارہ عبد کی از سر نو تعمیر بھی کی ہے جس کی تاریخ ''انگشت یار'' سے نکالی گئی تھی۔ اسی طرح شاہ طہماسپ نے روضۂ مطہر کے اندرونی حصہ میں بہت کچھ درستی اور مرمت کی۔ حرمِ شریف میں جو مسجد ہے اس کی توسیع کی، شمالی رواق بنوایا۔ شمال کی طرف صحن حسینیؑ کو وسعت دی جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے ''بحار الانوار'' جلد: ۱۸ کے صفحہ: ۷۵۳ پر اس طرح ورطۂ تحریر میں لایا ہے:-

''میری رائے میں حائر حسینیؑ صرف صحن قدیم پر مشتمل ہے۔ صفوی بادشاہوں نے صحن میں جو اضافہ کیا وہ حائر حسینیؑ میں داخل نہیں''۔

پھر آگے رقمطراز ہے:-

''اصل صحن کی جانب، قبلہ کی طرف، نیز دائیں اور بائیں جانب کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ جو کچھ اضافہ ہوا قبلہ کے مخالف سمت ہوا''۔

شیخ یوسف بحرینی ''حدائق الناضرہ'': جلد ۵، صفحہ: ۳۴۶ پر خامہ فرسا ہیں:-

''یہ مسجد جامع جو آج قبہ مقدسہ کے عقب میں موجود ہے۔ یہ پہلے موجود نہیں تھی۔ اس کو بنے ہوئے دو تین سو سال ہوئے ہیں۔ جب یہ مسجد بننے لگی تو صحن کی دیوار پیچھے ہٹا کر بنائی گئی تا کہ باقی سمتوں میں بھی اضافہ ہو سکے''۔

شیخ یوسف بحرینی نے ۱۱۸۶ھ میں انتقال کیا۔ لہذا جب مسجد اور شمالی صحن ان کی زیارت سے دو سو برس قبل تعمیر ہوا تھا تو یقیناً وہ زمانہ شاہ طہماسپ کا رہا ہوگا اور مسجد، رواق اور اس طرف کا صحن شاہ طہماسپ کی تعمیرات میں سے ہیں۔ یہ عمارتیں بہت ہی عظیم الشان ہیں۔ شاہ طہماسپ نے عتباتِ ائمہ اطہارؑ سے بے پناہ عقیدت اور مودت ہونے کی بنا پر ان کے لئے پانی کی طرح اپنی دولت بہا دی۔

شاہانِ صفویہ کی خدمات اسی حد تک محدود نہ رہ سکیں بلکہ جب بھی اُنہیں موقعہ ملا اُنہوں نے روضۂ اطہر کی تعمیر و ترقی اور رونق و جلال بڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

شاہ عباس (۹۹۶ھ تا ۱۰۳۸ھ) نے جب ۱۰۳۲ھ میں بغداد فتح کر لیا تو اس نے بھی روضۂ اطہر کی بڑی شاندار خدمات انجام دیں۔ شاہ عباس بہت راسخ العقیدہ اور سخت گیر شیعہ تھے۔ اسکے متعلق سر جان مالکم اپنی کتاب ''تاریخ ایران'' ص: ۲۵۱ پر رقمطراز ہیں:

''شاہ عباس نے بسیار مرتبہ حضرت امام رضاؑ کی زیارت کی۔ ایک مرتبہ وہ اور اُن کے تمام وزراء اور امراء اصفہان سے خراسان تک پیدل زیارت کو گئے''۔

نادر شاہ جو صفویین کے جانشین ہوئے دوسرے سلاطین کے بہ نسبت زیادہ خوش نصیب ثابت ہوئے کیونکہ اُنہیں مشاہد مقدسات کی خدمت کا بہت زیادہ حصہ ملا۔ جب اُنہوں نے ہندوستان کو فتح کیا اور بے شمار خزانے اور بیش بہا نوادرات لیکر وہ ایران لوٹے تو ان خزانوں کا کافی حصہ عتباتِ عالیات خصوصاً نجف اشرف کی نذر کیا۔

اس تعلق سے سید جمال الدین افغانیؒ اپنی کتاب ''عروۃ الوثقیٰ'' میں لکھتے ہیں:

''انگریز ان خزانوں کا بڑی حسرت و یاس سے ذکر کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ہندوستان پر قابض ہونے سے کچھ ہی دن قبل نادر شاہ نے ان خزانوں کو سمیٹ لایا تھا''

پھر نادر شاہ کی اہلیہ نے جو سلطان شاہ حسین صفوی کی دختر تھیں، یہاں ۱۱۳۵ھ میں مسجد تعمیر کروائی۔ اس مسجد کی تعمیر پر بے حد و حساب دولت صرف کی گئی۔

(تاریخ کربلائے معلیٰ ص: ۱۵)

❀❀❀

چوتھی فصل

قاچاریہ دور میں حائرِ حسینیؑ اور اُس کی اہم اصلاحات

بدست سلطان آغا محمد خان، فتح علی شاہ اور ناصر الدین شاہ

صفویوں کی مانند ایران کی نئی قاچاری حکومت نے بھی شعائر حائر مقدس کی تعظیم و تکریم میں غیر معمولی خدمات انجام دیے۔ اس خاندان کے دورِ شہنشاہیت میں بہت ہی اہم تجدید و اصلاحات ہوئیں جو گذشتہ ادوار میں بھی نہیں ہو سکی تھیں۔ حکومت نے اس کام کے لئے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ حائر مقدس کی عمارت تو ابتدائی عہد ہی سے انتہائی عظیم الشان اور محتشم چلی آ رہی ہے لیکن گنبد اقدس اور مینار یں پہلے کاشانی نقش و نگار سے مرصع تھیں۔ اس حکومت کے دوران قبہ مطہر اور میناروں پر سونا چڑھایا گیا۔ صحن کے مغربی حصہ میں مسجد تعمیر ہوئی۔ اسی طرح کی اور بہت سی اصلاحات اس دورِ حکومت میں ہوئیں۔

قاچاریوں نے اپنی ۶۵ برس کی مختصر مدتِ سلطنت میں تین مرتبہ قبہ اقدس پر سونا چڑھایا۔ پہلے سلطان محمد خان جس نے قاچاری شہنشاہیت کی داغ بیل ڈالی تھی نے یہ سعادت حاصل کی۔ اُنہوں نے ۱۲۰۷ھ میں جو اُن کی زندگی کا آخری زمانہ تھا قُبہّ مبارکہ کو سونے سے منڈھنے کا حکم دیا۔ تھوڑے ہی وقفے کے بعد وہابیوں کی غارتگری سے دس برس قبل سلطان فتح علی شاہ کے عہد حکومت میں دوسری بار اِس قُبہّ کو پھر سونے سے منڈھا گیا۔ چونکہ پہلا سونا ذرا کالا پڑ گیا تھا تو کربلا کے باشندوں نے سلطان فتح علی شاہ کو اس کی خبر کی تھی اور بادشاہ نے خط پاتے ہی حکم دے دیا کہ پہلی والی سونے کی اینٹیں اُکھاڑ کر نئی سونے

کی اینٹیں نصب کی جائیں ۔اِسی طرح کاظمین کے دونوں قُبّوں کو بھی سونے سے منڈھا گیا۔ (تحفۃ العالم سید جعفر آل بحر العلوم ۔ص:۳۰۸)

وہابیوں کی غارتگری کے بعد سلطان فتح علی شاہ قاچار کے ہاتھوں ۱۲۳۲ھ میں حائر مقدس میں بہت سی اصلاحات ہوئیں کیونکہ آقا شیخ جعفر آل کاشف الغطاؒ نے فتح علی شاہ سے ملاقات کر کے خصوصی طور حائر حُسینیؑ کی تجدید و مرمت کی طرف ان کی توجہ دلائی تھی۔ اسی طرح اُنہوں نے ایران کے مختلف شہروں کا دورہ کر کے قریہ قریہ اس کی تحریک چلائی تھی۔ ۱۲۳۲ھ سے پہلے سلطان فتح علی شاہ کے بیٹے محمد علی مرزا جب کہ وہ کرمان شاہ کے گورنر تھے، ۱۲۲۰ھ میں وہابیوں کی غارتگری کے بعد بہت کچھ حائر مقدس کی تجدید و مرمت کے سلسلے میں خدمات انجام دے چکے تھے۔اس بار پھر اُنہوں نے حرمِ شریف کی تعمیر و تزئین میں دل کھول کر حصہ لیا اور بے شمار دولت صرف کی۔ (تاریخ کربلائے معلیٰ ص:۱۶)

اسی عصر میں فتح علی شاہ کی زوجہ نے روضے کے دونوں میناروں پر سونا منڈھوایا۔

تیسری مرتبہ ناصر الدین شاہ جو فتح علی شاہ کے پوتے تھے، کے عہد میں قُبہ مبارکہ پر سونا چڑھایا گیا۔اسی طرح صحن کے مغربی حصے میں توسیع کی گئی۔ناصر الدین کی بنوائی ہوئی جلیل الشان مسجد کو مزید استوار اور مزّین کیا گیا۔یہ سب کچھ تیرہویں صدی کے اختتام پر ہوا،شاہ ناصر الدین نے ۱۲۷۶ھ میں علمائے ایران کے بزرگ شیخ عبدالحسین طہرانی مرحوم کو بہت گرانقدر رقم کے ساتھ کربلائے معلیٰ روانہ کیا تا کہ عتبات عالیات میں ضروری اصلاحات، تجدید اور تعمیر کی خدمات انجام دیں۔ ''تحفۃ العالم'' صفحہ:۳۰۸ پر مذکور ہے کہ ۱۲۷۶ھ میں سلطان ناصر الدین کے حکم سے آقائے شیخ عبدالحسین طہرانی کربلائے معلیٰ تشریف لائے اور قبہ حسینیہؑ کو پھر سے سونے سے منڈھوایا، صحن بنایا گیا، کاشی رنگ اور نقش ونگار سے مرصع ایوانات کی تعمیر ہوئی اور حضرت امام حسینؑ کے سرہانے کی جانب صحن میں

اضافہ کیا گیا۔اس کام سے فارغ ہونے پر وہ کاظمین میں بیمار پڑ گئے اور ۱۲۸۶ھ میں اُن کا انتقال ہو گیا اور اُن کی میت کربلا لا کر دفن کی گئی۔اُن کی رحلت سلطان ناصر الدین کی زیارتِ عتبات عالیات سے دو برس قبل ہوئی، کیونکہ ناصر الدین شاہ ۱۲۸۸ھ میں مدحت پاشا گورنر بغداد کے دورِ اقتدار میں مشاہد مشرفہ کی زیارت کو آئے تھے۔شیخ مرحوم باب السلطانیہ کے شمالی پہلو میں اپنے مخصوص مقبرہ میں مدفون ہیں، جو صحن مقدس کے شمال مغربی حصہ میں پڑتا ہے۔اُن کا مقبرہ صحن کے اندرونی حصہ میں آج بھی موجود ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ خود اُن کی ذاتی ملکیت ہے۔(مجالی اللطف ص:۴۴)

سلطان ناصر الدین شاہ نے صرف حائر حسینیؑ ہی کی تجدید و مرمت نہیں کی بلکہ روضۂ کاظمین اور سامرا میں بھی اسی قسم کی اصلاحات روبعمل لائیں۔قاچاری دور حکومت ہی میں خان قاچار نے ۱۲۲۵ھ میں قبر مطہر کا صندوق از سر نو بنوایا کیونکہ وہابیوں نے یہ متبرک صندوق ۱۲۱۶ھ میں توڑ پھوڑ کر نذر آتش کیا تھا۔

پانچویں فصل

مُلّا طاہر سیف الدین مرحوم کے ہاتھوں حائرِ حسینیؑ اور اُس کی آخری اصلاحات

تیرہویں صدی ہجری کے اختتام پر آخری بار قاچاری سلاطین کے ہاتھوں حائر حسینیؑ اور دیگر عتبات عالیات کی تعمیر و تجدید اور اہم اصلاحات انجام پائیں۔اُسکے بعد دنیا بھر میں مادّیت کے عفریت بے قابو ہو گئے۔بالخصوص ۱۹۰۸ء میں ایران و ترکی میں نئے دستور کے اعلان کے بعد تو مذہب سے لاتعلقی اور دوری مزید بڑھ گئی۔اس خلیج کے نتیجے

میں دنیا کے مختلف اطراف سے زائرین اور روساء واکابرین کے آنے میں خاصی کمی ہوگئی۔
چودھویں صدی کے آغاز کے بعد تقریباً نصف صدی تک حائر حسینیؑ کی کوئی خاص تجدید و مرمت عمل میں نہ آسکی۔ ان پچاس برسوں کے دوران کسی بھی بادشاہ امیر یا ... شخصیت نے نہ کوئی تجدید کی اور نہ کسی قسم کی اصلاح و تعمیراتی کاروائی میں دلچسپی دکھائی، یہاں تک خداوند عالم نے تقدس مآب ملاّ طاہر سیف الدین کو موفق کیا۔ وہ ۱۳۵۵ھ میں کربلائے معلّیٰ کی زیارت کو آئے اور انہوں نے خود بہ نفسِ نفیس کربلا کے معاملات میں دلچسپی لی اور جو لازمی اصلاحات و تعمیرات اُنہوں نے بھانپ لیں۔ بے شمار دولت صرف کر کے وہ سرانجام دیں۔ روضۂ اقدس کے مغربی مینار کو از سر نو تعمیر کرایا اور پہلے سے زیادہ دلفریب اور دیدہ زیب کردیا۔ پھر ۱۳۵۸ھ میں ضریح مقدس پر چاندی کی نئی جالی نصب کرائی جو ہندوستانی کاریگروں کی صناعی کا بہترین نمونہ ہے۔ سنہ ۱۳۶۰ھ میں دونوں میناروں پر نیچے سے لیکر اوپر تک سونا چڑھوادیا۔ گو کہ ان کی گرانقدر خدمات نے ان جلیل الشان خدمات کی یاد تازہ کردی جو ۲۸۳ھ میں داعی صغیر محمد بن الحسن الحسنی شاہ طبرستان نے انجام دی تھیں۔

چھٹی فصل

حائر مقدّس کے گرد شاہراہ کی تعمیر سے قبل

حائر حسینیؑ اور اُس سے ملحق مدارس و مراکز علمیہ

کربلائے معلّیٰ دینی واسلامی نقطۂ نگاہ سے بھی اور عملی حیثیت سے بھی عظیم المرتبت اسلامی مراکز میں سے ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ اوّلین دور سے ہی بزرگترین علماء، طلابِ علم اور حقیقت و کمال کے متلاشی یہاں آتے رہے اور بڑی بڑی علمی درسگاہیں اور مدرسے

یہاں قائم ہوئے۔ اسلامی بادشاہوں نے حائر مقدس کے گردونواح میں اِن اداروں کیلئے شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں تھیں۔ یہاں ایسی کیفیت تھی کہ بیچ میں حائر مقدس تھا اور اس کے چہار جوانب تاریخی مسجدیں، مدارس اور علمی مراکز تھے جیسے چاند کے گرد ہالہ ہوتا ہے۔ جرمنی کا ایک ادیب اور مورخ نیبوہر ۱۷۶۵ھ میں کربلائے معلیٰ کی زیارت کو آیا تھا۔ وہ اپنے سفرنامہ کی دوسری جلد کے صفحہ: ۲۱۸ پر حرم حسینیؑ کی تصویر کشی کرتے ہوئے اپنے تاثرات کچھ اس طرح قلمبند کرتا ہے:۔

"یہ جامع عظیم (حائر حسینیؑ) بہت بڑے قطعہ زمین پر واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف اہل علم اور اکابرِ دین کے مکانات ہیں"۔

مگر افسوس آج کل حائر حسینیؑ کے چاروں طرف سوا سڑک اور ہوٹلوں کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ وہ دینی و مذہبی مراکز جن کا ذکر نیبوہر نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے وہ سڑکوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ فقہائے کرام کے وہ عظیم الشّان مدرسے، طالبان علم کے وہ علمی مراکز، وہ قدیمی اور شاندار تاریخی مساجد جو حائر حسینیؑ کے چہار جوانب تھیں، جن سے حائر حسینیؑ کی عظمت وجلال میں چار چاند لگتی تھی، جن سے اس کی دینی منزلت اور علمی اہمیت ظاہر ہوتی تھی، جن علمی درسگاہوں سے بڑے بڑے علماء فارغ التحصیل ہو کر نکلے جنہوں نے دین مبین وشریعتِ اسلامیہ کی شاندار خدمات سرانجام دیں اور اپنے گہرے نقوش اور ناقابلِ فراموش کارنامے چھوڑے ان کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

شاہراہ کی تعمیر سے پہلے یہ درسگاہ اور علمی مراکز علم و دین کی اسی طرح خدمات انجام دے رہے تھے جسطرح جامع ازہر آج تک انجام دے رہا ہے جس پر پورے مصر کو ناز ہے۔

افسوس کہ کارپوریشن کی دست درازیوں کے نتیجے میں کیسے کیسے مدرسے، مسجدیں، علمی مراکز شاہراہ کی بھینٹ چڑھے۔ ہم اُن کی مختصر فہرست ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

حائرِ حسینیؑ کے مغرب میں حسب ذیل عمارتیں زمین بوس کی گئیں۔

(۱) **مدرسۂ زینبیہؑ:** یہ بہت ہی اہم اور شاندار علمی مرکز تھا۔ نہ اس مدرسے کا وجود رہا اور نہ ہی اس کے موقوفات۔

(۲) **شاہ ناصر الدین کی بنوائی ہوئی شاندار مسجد۔** یہ بیخ و بن سے اکھاڑ دی گئی

(۳) **مدرسۂ صدر اعظم نوری:** یہ کربلا کا بہت بڑا علمی مرکز تھا۔

حائرِ حسینیؑ کے شمالی سمت میں جو عمارتیں ڈھائی گئیں:

(۱) **مشہور تاریخی عمارت جامع راس الحسینؑ۔**

ابتدائی دور ہی میں اس مسجد کے بیچ میں ایک یادگار عمارت بنائی گئی تھی کیونکہ حضرت امام حسینؑ کا سر اقدس کوفہ لے جانے سے پہلے یہیں رکھا گیا تھا۔ تمام شیعہ اس مسجد کو انتہائی اہمیت دیتے آئے تھے، اُن کے نزدیک یہ جگہ انتہائی مقدس و محترم تھی۔

(۲) **جامع سردار حسن خان:** یہ مسجد فن تعمیر کا ایک نادر شاہکار سمجھی جاتی تھی۔

(۳) **مدرسہ سردار حسن خان:** یہ کربلائے معلیٰ کا بہت بڑا حوزہ علمیہ تھا۔ مشاہدہ مشرفہ میں مشکل سے اس کی مثال مل پائے گی۔ ہر دور میں بڑے بڑے علماء یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ شاہراہ کی وجہ میں اس کے موقوفات بھی ختم کر دیے گئے۔

اس شاہراہ کی تعمیر کے نتیجہ میں کربلا کی ایک امتیازی شان کا خاتمہ ہو کے رہ گیا۔ مدارس اور علمی مراکز کے انہدام کی وجہ سے اس کی امتیازی علمی حیثیت کھوگئی، اور فنی و تاریخی حسن بھی زائل ہو گیا اور اس نقصان عظیم کے عوض حاصل کیا ہوا صرف ایک شاہراہ۔ جس پر فرنگی لوگ صحن کے اردگرد اپنی موٹریں دوڑا سکیں اور اُنہیں پیدل چلنے کی زحمت گوارا نہ کرنا پڑے۔ اس طرح جو کچھ کیا گیا اُس پر نہ کربلا کے باشندے خوش ہوئے نہ علمائے دین بلکہ ہر طبقہ کی طرف سے اس ظلم و تعدّی پر صدائے ہی احتجاج بلند ہوئی۔

ساتویں فصل

حائر حسینیؑ اور حرم حضرت عباسؑ

حائر حسینیؑ کے شمال مشرق میں تین سو میٹر کی دوری پر حضرت عباسؑ کا روضہ اطہر ہے۔ جہاں آپ ساحل فرات پر شہید ہوئے تھے اور اسی جگہ دفن کئے گئے۔ یہ جگہ حائر حسینیؑ سے علاحدہ ہے۔ آپ کی قبر مطہر پر بھی ویسا ہی شاندار روضہ تعمیر کیا گیا ہے، جیسا کہ امام مظلومؑ اور دیگر ائمہ طاہرینؑ کی قبروں پر ہیں۔

حضرت عباسؑ پیاس سے نڈھال چھوٹے بچوں کی خاطر پانی لینے گھاٹ پر گئے تھے۔ جب آپ نے مشکیزہ میں پانی بھر لیا تو دشمن کی فوجیں سامنے آگئیں۔ شدید جنگ ہوئی۔ حضرت عباسؑ زندگی کی آخری سانسوں تک پانی کی حفاظت کرتے رہے کہ شاید کسی طرح پانی خیمۂ حسینیؑ تک پہنچ جائے تاکہ عورتیں، بچے اور شیر خوار اس پانی سے سیراب ہوں لیکن ع جہد عباسؑ کجا خواہش تقدیر کجا

(یعنی عباسؑ کی جدوجہد کہاں اور قسمت کی چاہت کہاں)۔ آپ جام شہادت نوش کر گئے۔

حضرت عباسؑ کی وفا ضرب المثل بن گئی۔ آپ فرات میں داخل ہو چکے تھے اور باوجودیکہ خود بھی تین روز کے پیاسے تھے اور پانی آپ کے قبضہ میں تھا، آپ چاہتے تو اپنی پیاس بُجھا سکتے تھے، لیکن بھائی، خواتین اور تین دن سے پیاسے بچوں کی العطش العطش آپ کے پیش نظر تھی۔ آپ نے چلو میں پانی لے کر دشمنوں کو دکھا کر پھینک دیا۔

حضرت عباسؑ جیسا بھائی امام حسینؑ کے علاوہ شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوا ہو، اسی

لئے آپ کی قبرِ مطہر پر بھی ویسا ہی شاندار روضہ تعمیر ہوا۔

روضۂ حضرتِ عباسؑ کی عمارت انتہائی عظیم الشان ہے۔ پوری عمارت سنگ سرخام کی ہے۔ قبر شریف پر چاندی کی جالی ہے۔ چاروں طرف عظیم الشان رواق ہیں، جس طرح حرم حسینیؑ میں ہیں۔

روضہ اقدس کے اوپر بہت عالیشان گنبد ہے جو کاشانی نقش ونگار سے مزّین اور فنِ تعمیر کا نادرِ روزگار شاہکار ہے۔ قبہ کے آگے دو بہت ہی خوبصورت اور بلند و بالا مینار ہیں۔ یہ مینار بھی کاشانی نقش ونگار سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ میناروں کے سرے پر سونا منڈھا ہوا ہے۔ میناروں کے مقابل باب قبلہ کے اوپر ایک بہت بڑا برج ہے جس میں گھڑیاں نصب کی گئی ہیں جس کے گھنٹہ کی آواز پورے شہر میں گونجتی ہے۔ روضہ اطہر کے چاروں اطراف انتہائی شاندار اور خوبصورت صحن ہے۔ چاردیواری بہت بلند و بالا ہے۔ البتہ حائرِ حسینیؑ اس روضہ سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ جس جس وقت حائرِ حسینیؑ کو تاخت وتاراجی، انہدام، تباہی و بربادی، تخریب کاری اور لوٹ کھسوٹ کا سامنا ہوا اس وقت روضۂ حضرتِ عباسؑ کو بھی ایسے ہی اندوہناک سانحات سے گذرنا پڑا۔

جنابِ عباسؑ دنیا میں اپنی شجاعت و بہادری اور ہیبت و جلال میں مشہور ہیں۔ اسی لئے آپ کو ضیغم اور غضنفر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہر ملک اور ہر خطۂ زمین کے بسنے والے شیعہ اور غیر شیعہ آپ کی زیارت کو آتے ہیں اور روضۂ اقدس میں امید و آرزو اور خوف و ہراس کے ساتھ ہدایا اور نذریں چڑھاتے ہیں۔ خوف و ہراس آپکی سطوت و دبدبہ سے۔ چنانچہ کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ آپ کا نام لے کر جھوٹی قسم کھا سکے اور اس بارے میں طرح طرح کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں اور امید و آرزو آپ کے فیض و کرم سے کہ باب الحوائج ہونے کے ناطے آپکے توسط سے اُن کی حاجتیں بر آئیں گی۔

آٹھواں فصل

خاندان ہاشمی کی خدمات

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد صوبہ عراق پر شاہ فیصل کی حکومت قائم ہوئی۔ انہوں نے بھی عتبات عالیات پر اپنی پوری توجہ مرکوز کی۔ وہ خود بنفس نفیس ان کی تعمیر و ترقی اور تجدید و مرمت کے معاملات میں سرگرمی کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ اس نے پٹرول کی آمدنی سے یا سرکاری اوقاف سے بڑی بڑی رقمیں حائر حسینیؑ کی تجدید و مرمت کے لئے مختص کیں۔ اسی طرح ان کے ولی عہد نے بھی پورے انہماک اور گہری عقیدت کا اظہار کر کے مشاہد مقدسہ کی خدمات بطریق احسن بجالائیں۔

❁❁❁

۱۹۵۰ء کے بعد اگرچہ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اوائل تک لوگ جوق در جوق آزادی کے ساتھ عتبات عالیات کی زیارات سے مشرف ہو رہے تھے لیکن بعد میں حسن البکر کے دور سے عزاداری اور زیارات مقدسہ پر پابندی عائد کی گئی جو صدام کے دور تک جاری رہی۔ ایران عراق جنگ کی وجہ سے جب عراق کی اقتصادی حالت متاثر ہوئی تب محض معاشی استحکام کیلئے یہ پابندی اٹھالی گئی البتہ عزاداری پر بدستور رہی۔ شکر ہے کہ صدام کے زوال اور جمہوریت کے آغاز کے بعد اب سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ البتہ وہابی دہشت گردی کا ہر وقت خطرہ منڈلاتا رہتا ہے۔ جنہوں نے سامرا کے عتبہ کو دھماکے سے اڑادیا تھا جسے پھر شاندار ڈھنگ سے تعمیر کیا گیا اور کربلا معلیٰ اور نجف اور دوسرے عتبات مقدسات کی تزئین و آرائش اور تجدید و مرمت کیلئے بھی پانی کی طرح دولت بہائی جارہی ہے اور زائرین کیلئے ہر قسم کی سہولیت بہم رکھی جارہی ہے۔ گذشتہ ایک دہائی سے حکومت لازماً ہر دن کچھ نہ کچھ تجدید و تزئین میں مصروف نظر آرہی ہے (ساجد)

TAREEKH-i-KARBAIA-e-MOULLA
By
Dr. Abdul Jawad ul
Translated by
Maqbool Sajid
PUBLISHED BY
Hazrat Imam Hussain (A.S)
Research & Publishing Centre,
Srinagar